کشمیر کے حملہ آور

اور

پنڈی سازش کیس

سابق میجر جنرل اکبر خان، عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7232336، فیکس: 7352332

www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب	....	کشمیر کے حملہ آور اور پنڈی سازش کیس
مصنف	....	سابق میجر جنرل اکبر خان عنایت اللہ
ناشر	....	گلفراز احمد علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سرورق	....	فضیل کیانی
سن اشاعت	....	جون 2008ء
قیمت	....	-/250روپے

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7352332-7232336

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

کشمیر کی قربان گاہ پر
خون کے نذرانے
دینے والوں کے نام

کشمیر — محلِ وقوع
روس
سنکیانگ
افغانستان
کشمیر
تبت
پاکستان
بھارت

فہرست

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارھواں باب

بارھواں باب

تیرھواں باب

چودھواں باب

پندرھواں باب

سولہواں باب

آخری باب

تعارف

کشمیر کے تنازعہ کے ساتھ چار مسئلے وابستہ ہیں —

- کشمیر کے متعلق پاکستان کی پالیسی۔
- کشمیر کی جنگ آزادی ۴۸-۱۹۴۷ء میں قبائلی پٹھانوں کا رول۔
- سابق میجر جنرل اکبر خان کی ذات
- اور "پنڈی سازش کیس"

اس کتاب میں جنرل اکبر خان نے واقعات اور انکشافات کی روشنی میں ان چاروں امور کو واضح پیش کیا ہے۔

یہ مصنف کی کتاب RAIDERS IN KASHMIR کا ترجمہ ہے جسے ہم "کشمیر پر حملہ اور پنڈی سازش کیس" کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں۔

کشمیر کی پہلی جنگ آزادی (۴۸-۱۹۴۷) کی ابتدا میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے پٹھان قبائل پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے سرینگر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ بھارت کے پہلے وزیراعظم پنڈت نہرو نے انہیں حملہ آور کہا تھا۔ جنرل اکبر خان کہتے ہیں کہ ہمیں حملہ آور کہلانے پر فخر ہے

محمد بن قاسم بھی حملہ آور تھا اور محمود غزنوی بھی حملہ آور تھا — اور کشمیر کے بے بس اور مجبور انسانوں کو ڈوگروں کے ظلم و تشدد اور جبری غلامی سے آزاد کرانے کے لیے پٹھانوں نے گھروں سے سینکڑوں میل دور آکر جو حملہ کیا تھا، وہ ہماری روایات کے عین مطابق تھا اور قرآن کے اس فرمان کی تعمیل کہ جس بستی میں مسلمانوں پر ظلم و تشدد ہو رہا ہو وہاں پہنچو اور انہیں ظالم حکمران

سے آزاد کرایا۔

کشمیر میں پٹھانوں کی جنگی کارروائیوں کے خلاف بعض حلقوں نے بہت کچھ کہا تھا ان کے حق میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم خان نے اپنی ایک کتاب میں قبائلیوں کی جنگی اہمیت اور کشمیر میں دلیرانہ مظاہروں کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ فوجی نوعیت کا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کوئی ایسا فوجی افسر ہی صحیح رائے دے سکتا ہے جس نے پٹھانوں کو کشمیر میں لڑتے اپنی آنکھوں دیکھا ہو۔

جنرل اکبر خان بھی ایک ایسے افسر ہیں جو نہ صرف ابتدا سے کشمیر کی جنگ میں شریک رہے بلکہ انہوں نے قبائلی پٹھانوں کو دشمن کے پہلوؤں پر ہراول پر اور اس کی مختلف پوزیشنوں پر شب خون مارنے اور گوریلا جنگ کے لیے استعمال کیا تھا۔ انہوں نے قبائلیوں کو سری نگر کے دروازے پر حملہ کرتے اور پیچھے ہٹتے بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے پٹھانوں کی پیش قدمی بھی دیکھی اور انہیں محاذ سے غائب ہوتے بھی دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ جنرل اکبر خان کو ۱۹۳۷-۳۸ کے دوران جب وہ برطانوی ہند کی فوج میں تھے وزیرستان میں قبائلی پٹھانوں کے خلاف لڑنے کا بھی موقع ملا تھا۔ لہٰذا وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ قبائلیوں کی جنگی اہمیت، لڑنے کے جذبے اور کشمیر کے محاذ پر ان کی کارکردگی کے متعلق وثوق اور اعتماد سے کوئی رائے دے سکتے ہیں۔

اس کتاب میں انہوں نے قبائلی پٹھانوں پر ہی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ لہٰذا اس کتاب کو جنگِ کشمیر کی مکمل تاریخ نہیں کہا جا سکتا نہ ہی جنرل موصوف نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ تاہم محاذِ کشمیر کے چیدہ چیدہ واقعات، معرکوں کی تفصیلات اور صف بندی کے پس منظر کو ایسے انداز سے بیان کیا ہے کہ پورے محاذ کی جھلک نظر آجاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کوتاہیوں لغزشوں اور دیدہ و دانستہ حقائق سے چشم پوشی کی واضح نشاندہی ہو جاتی ہے جو پاکستان کی حکومت، ہائی کمان اور کشمیری لیڈروں سے سرزد ہوئیں اور جس کا خمیازہ کشمیری مسلمان آج تک بھگت رہے ہیں اور کشمیر ہم سے دور ہی دور ہٹتا جا رہا ہے۔

اس طرح یہ کتاب قبائلی پٹھانوں کی کارکردگی کے ساتھ ساتھ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی روئیداد بن جاتی ہے۔ اس ضمن میں چند ایک انکشافات قارئین کے لیے نئے بھی ہوں گے اور قابلِ افسوس بھی۔ آپ دیکھیں گے کہ کشمیر کے متعلق ایک بھی صحیح قدم نہ اٹھانے کی وجہ سے

پاکستان کی اپنی سلامتی اور سالمیت کس طرح خطرے میں پڑی ہوئی ہے۔

پنڈی سازش کیس

کتاب کا دوسرا حصہ پاکستان کی تاریخ کے ایک ایسے واقعہ کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے جسے "پنڈی سازش کیس" کا نام دیا گیا تھا۔ اس کیس کے متعلق قوم کے کانوں میں جو کچھ بھی ڈالا گیا، وہ سرکاری مواد تھا، دوسرا فریق خاموش رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کے ذہن میں سازش کا افسانہ حقیقت کا روپ اختیار کر گیا۔ اب جنرل اکبر خان "پنڈی سازش کیس" کی اصل حقیقت بیان کر رہے ہیں۔

"پنڈی سازش کیس" کے متعلق ۳۰ نومبر ۱۹۷۰ء کے روز بہاولپور بار روم میں وکلا سے خطاب کرتے ہوئے کسان مزدور پارٹی کے سربراہ میجر محمد اسحاق نے کہا تھا۔

"اس کیس کے مرغنہ سابق میجر جنرل اکبر خان بتائے جاتے تھے اور حکومت نے جو کیس تیار کیا تھا اس میں ذرہ بھر صداقت نہیں تھی۔ اصل بات صرف یہ تھی کہ اس وقت کے انگریز کمانڈر انچیف پاکستان افواج جنرل گریسی نے جب کشمیر میں جنگ بندی کا حکم دیا تو اس وقت پاکستان کی افواج پیش قدمی کر رہی تھیں۔ سابق میجر جنرل اکبر خان نے اعلیٰ فوجی افسروں کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں اس فیصلے کے خلاف رد عمل کا اظہار کرنا مقصود تھا تاکہ حکومت ایسے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ فوجی افسروں نے اتفاق نہ کیا۔ حکومت کو اس کا علم ہو گیا۔ حکومت نے ان فوجی افسروں کو ترقی دے دی اور میجر جنرل اکبر خان کو چیف آف جنرل سٹاف بنا دیا۔ اس حیثیت سے انہوں نے اپنے گھر میں ایک اجلاس طلب کیا۔ اس میں مسئلہ کشمیر زیر بحث آیا لیکن کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ حکومت کو اس کا علم ہو گیا۔ میں اس اجلاس میں شریک نہ تھا۔ اس وقت پنجاب میں انتخابات ہو رہے تھے۔ انتخابات سے ایک روز قبل گرفتاریاں اور تحقیقات کا آغاز ہوا ــــ مجھے اس کیس میں ملوث بنانے کی کوشش کی گئی میرے احتجاج پر حکومت نے مجھے بھی سازش میں ملوث کر دیا۔ بعد میں آنے والی حکومت

نے اس کیس میں ملوث تمام فوجی افسروں کو اعلیٰ عہدے دیے اور مجھے دو
مربعے دیے ساہیوال میں اور پھر ایک عہدہ کی پیش کش کی گئی لیکن میں نے انکار کر دیا۔

(نوائے وقت۔ یکم دسمبر ۱۹۶۷ء)

پنڈی سازش کیس کی اصل حقیقت تفصیلات اس کتاب میں پڑھیے۔

کتاب کا تیسرا حصہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں صدیوں پرانی عسکری تاریخ کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ کشمیر کو کس طرح آزاد کرایا جا سکتا ہے اور پاکستان کا یہ خوف محض بے معنی ہے کہ اگر ہم نے کشمیریوں کی مدد کی تو بھارت پاکستان پر حملہ کر دے گا اور یہ وہم محض وہم ہے کہ بھارت اس قدر طاقت ور ہے کہ پاکستان کو تباہ کر دے گا۔ جنرل اکبر خان نے حقائق اور حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ہم کم نفری اور طاقت سے بھارت کے عزائم کو کچل سکتے ہیں اور کشمیر کو بھی آزاد کرا سکتے ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے؟ —— تفصیلی جواب یہ کتاب پیش کرے گی۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

پیش لفظ

منرو نے جس حملہ آور کہا تھا۔ اس نے دراصل ہم پر طنز کی تھی لیکن شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ آج کے دور کی جنگ میں حملے کو بہترین طریقہ جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔ اب تو جنگ کے مقصد کے حصول کے لیے طیاروں، کمانڈوز، گوریلوں، مورچا نشینی، ٹینکوں، توپخانے اور آبدوزوں کا استعمال "ضرب لگاؤ اور بھاگو" کے اصول پر بڑھتا جارہا ہے — تو میرا خیال ہے کہ حملہ آور کا نام ہماری شان کے خلاف نہیں۔ ہم یہ نام اپنا سکتے ہیں۔ فوجی لحاظ سے قبائلیوں کا طریقہ جنگ ایسا ہے کہ وہ بہترین اور دلیر حملہ آور تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حملہ آور کہلا کر ہم شاید چنگیز خان، تیمور لنگ، محمود غزنوی اور سکندر اعظم جیسی جنگجو شخصیتوں کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں جنہیں مورخوں نے حملہ آور کہا ہے۔

یہ کتاب چونکہ ذاتی روئیداد ہے اور کشمیر کی جنگ کی تاریخ نہیں اس لیے یہ علاقے، وقت، مقام اور حالات کے لحاظ سے محدود ہے۔ البتہ قارئین کشمیر کی جنگ کو طائرانہ نگاہ سے دیکھ سکیں گے اور اصل مسئلہ سمجھ جائیں گے۔

ایک باب میں فائر بندی کے بعد کے حالات، ردعمل، حال اور مستقبل کا جائزہ اور آخری باب میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلیوں کا تاریخی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

میں ان تمام حضرات کا شکرگزار ہوں جنہوں نے کتاب مکمل کرنے میں میری مدد کی اور ان کا بھی جن کے میں نے حوالے دیے ہیں۔

اکبر خان

کراچی جولائی ۱۹۷۰

پہلا باب

کشمیر کے حملہ آور

صدیوں سے پشاور شہر کے بازاروں میں داستان گوئی کا فن رائج اور مقبول رہا ہے۔ میں نے کئی بار اس فن کے ماہرین سے داستانیں سنیں اور محظوظ ہوا۔ لیکن میں جب خود ایک داستان سنانے لگا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میں اچھی قسم کا داستان گو نہیں ہوں۔ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے اور کیسے شروع کروں۔ میں نے کشمیر کی وادی میں پھیلی ہوئی گہری دھند میں سے ابھرتے ہوئے کچھ انسان دیکھے تھے جو عام انسانوں کی قد و قامت سے بڑے نظر آتے تھے اور وہ دیو پیکروں کی طرح گھوم پھر رہے تھے۔ میں اپنی داستان وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے وہ مجھے پہلی بار نظر آئے تھے۔

وہ حملہ آور تھے۔ وہ تاریکی میں ٹوٹی پھوٹی زمین اور اونچی نیچی گھاٹیوں میں بڑے اطمینان اور احتیاط سے دشمن کے قریب تر ہو کر اس پر جھپٹنے کے لیے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

یہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی آدھی رات کا وقت تھا۔ وہ ریاست کشمیر میں بجلی کی رفتار سے داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے پانچ دنوں میں ایک سو پندرہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور اب وہ سری نگر سے صرف چار میل دور رہ گئے تھے جہاں سے انہیں سری نگر کی جھلملاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

بارہ مولا تیس میل پیچھے رہ گیا تھا۔ تین روز پہلے بارہ مولا لیا جا چکا تھا۔ وہاں چودہ ہزار میں سے تین ہزار افراد زندہ بچے تھے۔ مہاراجہ کشمیر سری نگر سے بھاگ گیا تھا۔ اس نے ہندوستان کو ان الفاظ میں ریاست کی تباہی کی تفصیل سنائی تھی — ایک جنگلی لشکر نے ریاست پر حملہ کر کے ادھم مچا رکھا ہے۔ یہ لشکر ساری ریاست کو تہ تیغ کرنے کے لیے سری نگر پر قبضہ کرنے

کے لیے بڑھا آ رہا ہے — دلی میں وی پی مینن ہندوستانی حکومت کو مشورہ دے رہا تھا کہ کشمیر میں فوراً فوجی مدد بھیجی جائے۔ اس نے اپنی حکومت کو ہندوستان پر گزشتہ آٹھ صدیوں میں مسلمانوں کے حملے، خصوصاً محمود غزنوی کے سترہ حملے یاد دلا کر کہا — "آج سری نگر پر حملہ ہوا ہے تو کل دلی پر ہوگا۔"

دوسرے ہی دن ہندوستان نے طیاروں کے ذریعے اپنی فوج کشمیر میں بھیج دی جس کی مدد کے لیے فوری طور پر لڑاکا طیارے اور توپخانے بھی بھیج دیے گئے تاکہ حملہ آوروں کو روکا جا سکے لیکن ہندوستان کی اس جنگی قوت کو بری طرح تتر بتر کر دیا گیا اور ان کا ایک کمانڈر کرنل رائے مارا گیا۔ اب سری نگر کے چوتھے سنگ میل پر حملہ آوروں کے راستے میں سڑک پر رکاوٹیں کھڑی تھیں جن کے عقب سے دشمن کی مشین گنیں گولیوں کی بوچھاڑیں فائر کر رہی تھیں اور ان کے پیچھے توپ خانہ تھا جو بے پناہ گولہ باری کر رہا تھا۔

حملہ آور جوں جوں آگے بڑھتے گئے، سری نگر کے ارد گرد پانی زیادہ ہی زیادہ ہوتا چلا گیا۔ اس میں دریا کا پانی بھی تھا، چھوٹی بڑی جھیلیں بھی اور بارش کا پانی بھی جگہ جگہ جمع تھا۔ یہ پانی رکاوٹیں انہیں مجبور کر رہی تھیں کہ وہ سڑک پر ہی رہیں اور کوئی راستہ نہ تھا۔ آخر انہیں یہی ایک صورت نظر آئی کہ سڑک کی رکاوٹ اور اس کے دفاعی مورچے پر سامنے سے ٹوٹ پڑیں۔

میں کشمیر میں قبائلی پٹھانوں کی یلغار کی داستان یہیں سے شروع کرتا ہوں۔

قبائلی پٹھان —
کشمیر میں کیوں گئے تھے؟

اس سوال کا جواب یہی اور صرف یہی ہے کہ قبائلی پٹھانوں کو ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں کے مسائل و مصائب اور مظالم کے ساتھ گہری دلچسپی تھی۔

چار ہی مہینے پہلے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے روز برصغیر کو اس صورت میں آزادی ملی تھی کہ ملک تقسیم ہو گیا تھا اور دولت مشترکہ برطانیہ کی دو آزاد اور خود مختار مملکتیں معرض وجود میں آئی تھیں۔ برصغیر میں برطانوی حکومت کی حکمرانی تو اسی روز ختم ہو گئی تھی لیکن دونوں نئی حکومتیں ابھی اپنی اپنی مملکت پر پوری طرح عملداری قائم نہیں کر سکی تھیں کیونکہ چالیس کروڑ آبادی اور ۱۸۰۰۰۰۰ مربع میل رقبے کے پرانے ہندوستان میں ۵۶۰ ریاستیں تھیں جنہوں نے ابھی دونوں میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق نہیں کیا تھا۔

ان ریاستوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت کسی ایک مملکت کے ساتھ الحاق کر لیں۔ وہ چونکہ آزاد نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس لیے توقع تھی کہ ملک کی تقسیم تک راجے مہاراجے اور نواب الحاق کا فیصلہ کر لیں گے۔ بعض نے فیصلہ کر بھی لیا تھا۔ باقی جو ریاستیں رہ گئی تھیں وہ جغرافیائی لحاظ سے ایک یا دوسری کے اس قدر قریب تھیں کہ متعلقہ مملکت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ محض رسمی حیثیت رکھتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم ریاست جموں و کشمیر تھی جو دوسری بڑی ریاست تھی۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ ریاست تمام تر برصغیر کے لیے اس لیے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں تھی کہ یہ ہندوستان اور پاکستان دونوں سے ملحق ہے بلکہ اس لیے کہ شمال میں اس کے اور روس کے درمیان افغانستان کا ذرا سا علاقہ ہے اور اس کی

سرحد چین سے مشترک ہے۔

جب برطانوی حکومت نے ملک کی تقسیم کا اعلان کیا تو یہی توقع تھی کہ اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر پاکستان کے بنیادی تصور میں شامل تھا۔ پاکستان کا "ک" کشمیر کا ہے۔ ملک کی تقسیم کی بنیاد یہی تھی کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کہلائیں گے۔ اس بنیاد پر کشمیر کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اس کی چالیس لاکھ آبادی میں ۸۰ فیصد مسلمان تھے اور اس لیے بھی کہ ہندوستان کے ساتھ اس کی کوئی سڑک، کوئی ریل اور کوئی دریائی راستہ نہیں ملتا تھا۔ اقتصادی طور پر اس کا ہندوستان کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔

یہی احوال و کوائف تھے جن کے پیش نظر توقع رکھی گئی تھی کہ کشمیر کے عوام طوعاً و بشاشت پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کریں گے مگر اس کا فیصلہ ریاست کے غیر مسلم حکمران مہاراجہ کے ہاتھ تھا۔ وہاں جلدی فیصلہ کرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے تقسیم کے اعلان سے چند ہفتے بعد جب کہ ابھی تقسیم ہوئی نہیں تھی، دلی میں قائد اعظم سے ایک وفد نے ملاقات کی اور انہیں کشمیر کے متعلق کچھ خدشات سے آگاہ کیا تھا۔ اس وقت قائد اعظم پاکستان کے نامزد گورنر جنرل تھے جبکہ وہاں آرمڈ فورسز پارٹیشن سب کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ گیا تھا۔ اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ مہاراجہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے حیل و حجت پر تلا ہوا ہے، اور یہ خطرہ بھی ہے کہ کشمیر کا مسلمان لیڈر شیخ عبداللہ جو آزادی ہند کی تحریک کا ہیرو تھا اور جس نے پاکستان کے تصور کی مخالفت کی تھی، مہاراجہ کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔

قائد اعظم نے وفد کو یقین دلایا تھا کہ دو افراد کا فیصلہ ساری ریاست کے مستقبل کو مسخ نہیں کر سکتا۔ قائد اعظم نے کہا کہ نظریہ پاکستان نے جس طرح سارے ہندوستان کو گرفت میں لے لیا تھا اسی طرح کشمیر کو بھی گرفت میں لیے ہوئے ہے لہٰذا شیخ عبداللہ کی مخالفت کے باوجود کشمیری مسلمان پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیں گے۔ اس کے علاوہ جغرافیائی لحاظ سے کشمیر صرف پاکستان کے ساتھ ہی الحاق کر سکتا ہے۔

وثوق سے کہا جا رہا تھا کہ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرے گا مگر اس وثوق کو بیہودہ ہوئے اس وقت لگا جب ریڈکلف ایوارڈ نے دونوں ملکوں کی حد بندی کا اعلان کیا۔ اس کے تحت پاکستان سے متصل علاقے کا کچھ ایسا حصہ ہندوستان کو دے دیا گیا تھا

جس میں سے کشمیر اور ہندوستان کے درمیان پختہ سڑک بنائی جا سکتی تھی۔ اس وقت کشمیر کا
دنیا کے ساتھ رابطہ دو سڑکوں کے ذریعے تھا۔ دونوں پاکستان میں سے گزرتی تھیں۔ لیکن
اب ہندوستان کے لیے ایسی صورت پیدا کر دی گئی تھی جس میں جموں سے کٹھوعہ تک جانے والا
غیر پختہ راستہ ہندوستان تک پختہ سڑک بنایا جا سکتا تھا۔

اس طرح کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی کم از کم ایک دشواری دور کر دی گئی تھی۔
خیال یہی تھا کہ مہاراجہ نے ہندوستان کے ساتھ گفت و شنید شروع کر دی ہوگی۔ پاکستان کے
ساتھ کشمیر کے الحاق میں کوئی دشواری تھی ہی نہیں۔ جولائی ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کے اس
وقت کے وائسرائے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو یقین دلا دیا تھا کہ اگر مہاراجہ پاکستان سے
الحاق کرلے تو ہندوستان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کشمیر کے اندر سے بھی کسی دشواری کے
پیدا ہونے کا امکان نہیں تھا کیونکہ دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں ـــــ مسلم کانفرنس اور نیشنل
کانفرنس ـــــ کے لیڈر جیلوں میں بند تھے۔ اس کے باوجود مہاراجہ کوئی فیصلہ نہیں کر رہا تھا
اس نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ پاکستان کے ساتھ معاہدہ برقرار STAND STILL
ACREFMENT کر لیا یعنی ریاست کی موجودہ حیثیت قائم رہے گی۔ یہ معاہدہ کر کے
وہ بے فکر ہو کر بیٹھ گیا مگر سمجھ نہ سکا کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھ گیا ہے جو فضا
برصغیر میں پیدا ہو چکی تھی وہ ریاست میں بھی پیدا ہو سکتی تھی۔

ایک مدت سے انڈین نیشنل کانگرس برصغیر کی آزادی کی جدوجہد کی قیادت کر رہی
تھی۔ اس کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ ہندوستان تقسیم نہیں ہوگا اور اس میں اکثریت کا جمہوری
راج ہوگا۔ مسلمان لیڈروں کو چونکہ یقین تھا کہ اکثریت غیر مسلم قوم کی ہوگی جو مسلمانوں کو اقلیت
سمجھ کر اپنے ماتحت رکھے گی۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے الگ مملکت کا مطالبہ کیا تھا
جس کا نام پاکستان تجویز کیا گیا تھا۔ اس مطالبے سے سارے ملک میں کشیدگی پیدا ہو گیا تھا۔
تقسیم سے ایک سال پہلے سے فرقہ وارانہ فسادات غیر معمولی طور پر بڑھ گئے اور جب تقسیم ہو گئی
تو ایک خوف نے لوگوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ اس موقع پر امن و امان تہس نہس ہو گیا۔ لوگوں
نے اخلاق اور قانون کی دھجیاں اڑا دیں اور بے دریغ قتل عام ہوا۔ ایسے ردعمل سے کشمیر
کس طرح بچا رہ سکتا تھا؟
کشمیر میں اقلیتی قوم یعنی غیر مسلموں پر مسلمانوں کا خدشہ سوار تھا اور مسلمان چونکہ نہتے

تھے اس لیے مہاراجہ اور اس کی غیر مسلم فوج سے ڈرتے تھے۔ ابھی تک کوئی خونریزی تو نہیں ہوئی تھی۔ مسلمان صبر و تحمل سے کام لے رہے تھے مگر کب تک۔ مہاراجہ دوسری ریاستوں کے برعکس الحاق کا کوئی فیصلہ نہیں کر رہا تھا بلکہ اس مسئلے کو غیر معینہ مدت کے لیے معلق میں رکھ رہا تھا۔ نہ ہی عوام کو آئینی حکومت میں شامل کر رہا تھا اور نہ ہی کوئی ایسے آثار نظر آتے تھے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو رہا کرے گا۔ ریاست میں اس کے اس رویے کا کچھ نہ کچھ ردعمل تو ہونا ہی تھا۔

اور وہ ردعمل ہو کے رہا۔

دوسرا باب

کشمیر میں مسلح بغاوت —

پاکستان میں کھوکھلی کانفرنسیں

ستمبر کے آغاز میں برصغیر کی تقسیم کے دو ہفتے بعد میں چند دنوں کے لیے مری گیا۔ مری میں گرمیاں گزارنے کے لیے جو لوگ آئے تھے جا چکے تھے پھر بھی مری میں بہت سے لوگ تھے۔ یہ کشمیر کے مہاجرین تھے ہر کسی کی زبان پر یہی تھا کہ کشمیر میں فسادات شروع ہو چکے ہیں۔ لوگ اس قسم کی باتیں سناتے تھے کہ صرف غیر مسلم شہری ہی نہیں بلکہ ریاست کی فوج بھی مسلمانوں کا قتل عام اور لوٹ مار کر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کا خونی ڈرامہ ریاست میں بھی شروع ہو چکا تھا۔

اگر مبالغہ آرائی کو نظر انداز کر دیا جاتا تو بھی اس سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں تھی کہ گڑبڑ کی پہلی بازگشت ہو چکی ہے اور کشمیر میں ہنگاموں کی ابتدا ہو گئی ہے۔ بہرحال حیران کن نہیں تھا اب یہ سوچنا بیکار تھا۔ اگر بھارت چاہتا تو حالات اس حد تک نہ بگڑتے۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کو قابل احترام لیڈر سمجھا کرتا تھا۔ میں ایسی خوش فہمی میں بھی مبتلا تھا کہ یہ دونوں لیڈر فرقہ وارانہ جذبات اور ایسے گھٹیا عزائم سے بلند ہیں۔ انھوں نے پاکستان کی جو مخالفت کی تھی وہ قابل فہم تھی۔ اب جب کہ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا ان کے لیے دانشمندانہ اقدام یہی تھا کہ پاکستان کو قبول کرتے اور ان کے دلوں میں اگر ایسی خواہش ہوتی کہ پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ مہاراجہ کشمیر کو بتاتے کہ اس کی ریاست کا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ دونوں لیڈروں کی سوچ بڑی ہی مختلف ثابت ہوئی۔ اب ہم کسی طرح
اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ہم اپنے کشمیری بھائیوں کے جان و مال اور عزت و آبرو
کے تحفظ سے نگاہیں نہیں پھیر سکتے تھے۔ بلکہ خود پاکستانیوں کے تحفظ اور فلاح و بہبود کا تقاضا یہ تھا کہ
کشمیر بھارت کی جھولی میں نہ جائے۔ نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی
فوج کشمیر کی سرحد پر آ کر ڈیرے ڈال دے تو پاکستان کے تحفظ کے لیے کتنا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔
کشمیر ہندوستان کے پاس چلے جانے سے یہ خطرہ بھی تھا کہ ہندوستان لاہور سے راولپنڈی تک
جانے والی ایک سو اسی میل لمبی سڑک سے چند ہی میل دور فوجی اڈے قائم کرے گا۔ جنگ کی صورت
میں ہندوستان کے یہ اڈے ہماری اہم فوجی اور شہری رابطہ لائن کے لیے بہت بڑا
خطرہ بن سکتے تھے۔

اس رابطہ لائن کے دفاع کے لیے ہمیں اپنی فوج کا بہت سا حصہ اس کے ساتھ رکھنا
تھا جس سے دوسرے فرنٹ کمزور ہونے کا خطرہ تھا اور اگر ہم دوسرے فرنٹ کو مضبوط کرتے تو ہندوستان
ہماری رابطہ لائن توڑ کر لاہور، سیالکوٹ، گجرات اور جہلم کو ہمارے فوجی مرکز یعنی راولپنڈی
سے کاٹ سکتا تھا۔ کشمیر پر ہندوستانی قبضے کی صورت میں ہندوستان ہزارہ اور مری کو فوراً جنگ
کی زد میں لا سکتا تھا جب کہ یہ جگہیں فرنٹ سے دو سو میل دور ہیں۔ یہ تو جنگ کی صورت میں
ہوتا۔ امن کی صورت میں بھی یہ خطرات ہماری آزادی پر مسلط رہتے۔

جب ہم اقتصادی لحاظ سے دیکھتے تھے تو بھی ہماری پوزیشن واضح ہو جاتی تھی۔ ہماری
زرعی معیشت کا دار و مدار ان دریاؤں پر تھا جو کشمیر سے نکلتے ہیں۔ مثلاً ہیڈ ورکس تو تھا ہی
کشمیر میں، مرالہ ہیڈ ورکس سرحد سے ایک ہی میل دور تھا۔ ہم سوچتے تھے کہ کشمیر کے ہندوستان
کے ساتھ الحاق سے ہماری معیشت کی کیفیت کیا ہو جائے گی؟ خود کشمیر کی اقتصادیات
پاکستان سے وابستہ تھیں کیونکہ اس کی واحد تجارتی شاہراہ جو سارا سال کھلی رہتی تھی کوہالہ اور
مظفر آباد سے پاکستان میں داخل ہوتی تھی۔ چیل اور دیودار کے شہتیر جو کشمیر کی سب سے زیادہ
آمدنی کا ذریعہ تھے، دریائے جہلم کے راستے پاکستان میں ہی آتے تھے۔ لہٰذا پاکستان کے
ساتھ کشمیر کا الحاق محض خواہش نہیں تھی بلکہ ہمارے آزاد اور خود مختار وجود کے لیے ایک ضرورت
تھی ۔۔۔ اور جب ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ کشمیریوں کی اکثریت پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتی
ہے تو ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہو گئی کہ کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہی ہونا چاہیے

مگر اب جب کشمیری مسلمانوں کو ہی کشمیر سے دھکیل باہر کیا جا رہا تھا اور کشمیر میں جو مسلمان رہ گئے تھے ان کا الحاق جبراً ہندوستان سے کرایا جا رہا تھا تو ہماری یہ کوششیں بے معنی اور ہمارا دعویٰ مضحکہ خیز ہو کے رہ گیا تھا۔

کشمیر کے لیے چار ہزار رائفلیں

میرا ذہن ابھی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ کسی نے میرا تعارف سردار ابراہیم سے کرایا۔ بعد میں سردار ابراہیم آزاد کشمیر کے پہلے صدر بنے تھے۔ اس وقت تک وہ پاکستان میں کوئی زیادہ معروف نہیں تھے۔ مسلم کانفرنس جو پاکستان کی حامی تھی، کے لیڈر ابھی کشمیر کی جیلوں میں بند تھے۔ سردار ابراہیم ان لوگوں میں سے تھے جو کشمیر کے مستقبل کے لیے بہت زیادہ سرگرم تھے۔ وہ پاکستان میں مدد حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ سردار ابراہیم نے بتایا کہ پُرامن بات چیت کا وقت گزر چکا ہے۔ اب احتجاج کو طاقت سے دبایا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کشمیر کے چند ایک حصوں میں لوگ علانیہ بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ اپنے تحفظ کے لیے اور مہاراجہ کشمیر کو ہندوستان کے حوالے کرنے سے باز رکھنے کے لیے انھیں ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔ سردار ابراہیم کا خیال تھا کہ بغاوت شروع کرنے کے لیے پانچ سو رائفلیں درکار ہیں۔ میرے خیال میں ان کا اندازہ خاصا کم تھا مگر رائفلوں کی اتنی کم تعداد کا حصول بھی ممکن نہیں تھا۔

سب سے اہم سوال تو یہ تھا کہ کیا ہماری حکومت (پاکستان) اس سلسلے میں عملی طور پر کچھ کرے گی؟ — بعد میں پتہ چلا کہ اس سلسلے میں کوئی کارروائی پہلے سے ہی ہو رہی تھی۔ کچھ دنوں بعد مسلم لیگ کے ایک لیڈر میاں افتخار الدین لاہور سے مری آئے۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں یہ کام سونپا گیا ہے کہ سرینگر جا کر کشمیری لیڈروں سے ملیں اور جائزہ لیں کہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے امکانات کتنے کچھ ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر کشمیر کے عوام کو اپنی قسمت اور مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کیا گیا تو مسلم لیگ جو اس وقت پاکستان کی برسر اقتدار پارٹی تھی، کشمیری مسلمانوں کو مدد دینے کے لیے انتظامات کرے گی اور کشمیر کو ہندوستان کی جھولی میں گرنے سے روکے گی۔ میاں افتخار الدین کو کوئی زیادہ امید

نہیں تھی کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے۔ البتہ انہیں یہ امید ضرور تھی کہ وہاں جاکر کم از کم فوری ضرورت کے متعلق شکوک رفع ہو جائیں گے۔ میاں صاحب نے مجھے بتایا کہ اگر صورت حال ناساز خواہ ہوتی تو ایک پلان تیار کر کے وہ ہمراہ لے جائیں گے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں پلان تیار کروں۔

اس مجوزہ پلان کا مقصد تو بالکل واضح تھا یعنی کشمیر کا الحاق پاکستان سے کرانا ہے مگر یہ بالکل ہی واضح نہیں تھا کہ مسلم لیگ اس پلان میں کیا مدد دے سکے گی۔ میاں افتخار الدین نے بتایا کہ کچھ رقم دی جا سکتی ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کتنی دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جو بھی کارروائی کی جائے گی وہ غیر سرکاری ہوگی۔ پاکستان کی فوج یا افسر اس میں عملاً حصہ نہیں لیں گے ــــ ان کوائف اور غیر واضح حقائق کی روشنی میں میں نے اگلا سارا دن سردار ابراہیم اور ان کے ساتھی لیڈروں کے ساتھ صلاح مشورے میں گزارا اور راولپنڈی جا کر پلان تیار کیا۔

ہتھیاروں میں ہم صرف رائفلیں حاصل کر سکتے تھے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ ہمیں ضرورت کتنی رائفلوں کی ہے بلکہ سوال یہ تھا کہ ہم کتنی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں جی ایچ کیو میں ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان کا ڈائریکٹر تھا۔ اس لیے مجھے اچھی طرح علم تھا کہ پاکستان آرمی کے پاس ہتھیاروں کی پوزیشن کیا ہے جو اسلحہ بارود ملک کی تقسیم کے نتیجے میں ہمارے حصے میں آیا تھا اس کا بیشتر حصہ ابھی ہندوستان میں پڑا تھا۔ اگر یہ سارا اسٹاک پاکستان میں ہوتا تو بھی اس میں سے کشمیر کو کچھ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے کمانڈر انچیف کو حکومت کے حکم کی ضرورت تھی۔ چونکہ کمانڈر انچیف انگریز تھا اس لیے اسے اعتماد میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا رائفلیں حاصل کرنے کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔

خوش قسمتی سے پنجاب پولیس کو چار ہزار رائفلیں دینے کے لیے جی ایچ کیو میں حکومت کی پہلے سے ہی منظوری موجود تھی۔ پولیس ان رائفلوں کا کوئی مطالبہ نہیں کر رہی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس کو ان رائفلوں کی کوئی فوری طور پر ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے جو پلان تیار کیا اس کی بنیاد کم از کم چار ہزار رائفلوں پر رکھی۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ پولیس اگر دو ماہ تک وہ اپنی چار ہزار رائفلیں دے دے کشمیر کے لیے دے دے۔ پھر میں نے مزید ہتھیاروں کے لیے سوچا کہ جو رقم ملے گی اس سے درے کا بنا ہوا اور غیر ملکی اسلحہ خرید

جاتے گا۔ میں نے یہ سراغ بھی لگایا کہ ایک آرڈیننس ڈپو میں پرانے ایمونیشن کا سٹاک پڑا
ہے جسے بیکار کر دیا گیا ہے۔ یہ سٹاک سرکاری طور پر کراچی لے جا کر سمندر میں پھینک دینے کے
لیے الگ رکھا ہوا تھا۔ آرڈیننس ڈپو کے کرنل اعظم خان زادہ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ایمونیشن
مجھے کشمیر میں استعمال کے لیے چوری چھپے دے دیں گے جہاں تک فوج کا تعلق تھا، اسے
اس اطلاع سے مطمئن کیا جا سکتا تھا کہ ایمونیشن سمندر میں پھینک دیا گیا ہے۔

اس پلان کے انتظام اور اہتمام کے لیے تربیت یافتہ اور تجربہ کار افراد کی ضرورت
تھی۔ فوج میں سے کسی افسر کو نہیں لیا جا سکتا تھا۔ پاکستان میں دوسری جنگ عظیم والی انڈین
نیشنل آرمی کے کچھ سینئر سابق فوجی افسر موجود تھے جن کے متعلق توقع تھی کہ وہ اس ذمہ داری
کو سنبھال لیں گے۔ فوج سے اسلحہ بارود، مواصلاتی نظام، رضاکاروں اور راہنمائی وغیرہ کی
صورت میں بہت سی مدد کی ضرورت تھی مگر یہ مدد کھلے بندوں نہیں مانگی جا سکتی تھی کیونکہ
اسے کمانڈر انچیف سے جو انگریز تھا اور دوسرے انگریز افسروں سے پوشیدہ رکھنا تھا۔ اس
وقت پاکستان آرمی میں انگریز افسر بھی تھے۔ پاکستان آرمی میں البتہ کچھ افسر ایسے تھے جنہیں
اعتماد میں لیا جا سکتا تھا وہ بہت سی مدد کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ اس وقت تک صرف
مجھے ہی مدد کے لیے کہا گیا تھا میں کم و بیش بیس افسروں سے جونیئر تھا۔ بعد میں صورت حال
خاصی خراب ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ہر ایک بات ہر کسی سے پوشیدہ رکھنی تھی۔ اس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدد کے سلسلے میں بھی نقصان ہوا اور خیر سگالی بھی ختم ہوئی، آگے چل کر مخالفت
اور چپقلش بھی پیدا ہوئی۔

پلان جو پاکستان میں تیار ہوا

آخر کار میں نے ایک پلان تحریر کیا جسے "کشمیر کے اندر مسلح بغاوت" کا عنوان دیا چونکہ
پاکستان کی طرف سے مداخلت اور جارحیت خارج از عمل تھی اس لیے ہمیں اپنی سرگرمیاں
اور کارروائیاں اس پیمانے پر کرنی تھیں کہ کشمیریوں کو کشمیر کے اندر مضبوط کیا جائے۔ اس کے
ساتھ ہی ہمیں ہندوستان کی طرف سے مسلح شہریوں اور فوجی امداد کو کشمیر میں آنے سے روکنا تھا
مہاراجہ کی اپنی فوج کی نفری تقریباً نو ہزار تھی۔ اس میں تقریباً دو ہزار مسلمان تھے۔ ان سے

ہمیں یہ توقع تھی کہ وہ بغاوت کے خلاف اپنے آپ کو بے اثر بنائے رکھیں گے یا ضرورت پڑی
اور موقع ملا تو وہ ریاستی فوج سے نکل آئیں گے۔

ان کے نکل آنے یا بے اثر رہنے سے مہاراجہ کے پاس سات ہزار نفری رہ جاتی تھی۔
کشمیر ایسا علاقہ ہے کہ اس نفری کو بری طرح بکھر جانا تھا اور ہمیں پوری توقع تھی کہ کشمیری
اسے بتدریج ختم کر دیں گے لیکن سب سے زیادہ ضروری اقدام یہ تھا کہ مہاراجہ کو بھارت
سے فوجی مدد نہ پہنچ سکے اور اس مقصد کے لیے ان تمام راستوں کو بند کرنا ضروری تھا جن سے
مدد آنے کا امکان تھا۔

ایسا ایک راستہ کٹھوعہ سے جموں تک تھا۔ یہ کچا راستہ تھا جو اچھے موسم میں استعمال
ہوتا تھا اور ایسے خراب علاقے میں سے گزرتا تھا جہاں ہر موڑ پر چند مسلح شہریوں کو
گزرنے سے روک سکتا تھا۔ باقاعدہ فوج کو روکنا ذرا مشکل تھا لیکن ابھی ہندوستان سے
فوج کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ڈیڑھ ایک مہینے بعد بارشوں کی وجہ سے اس
راستے کو کیچڑ سے بھر جانا تھا جو دسمبر میں دو دو سال میں برف باری سے اس راستے کو بالکل ہی
بند ہو جانا تھا۔ کشمیری مسلمانوں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس راستے کو مستقل طور پر مسدود کر دیتے
لیکن بارشوں اور برف باری کی رکاوٹوں سے ہمیں تیاری اور مورچہ بندی کا خاصا وقت مل جاتا تھا۔

ہندوستان سے مدد آنے کا دوسرا راستہ فضائی تھا۔ فوجوں کو طیاروں کے ذریعے اور سرینگر
میں اتارا جا سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے سری نگر کا ہوائی اڈہ شہر سے آٹھ میل دور تھا جہاں طیاروں سے
اترتی ہوئی فوج کے تحفظ کا فوری انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ رائفلوں سے مسلح صرف دو سو آدمی
طیاروں کو اترتے وقت نقصان پہنچا سکتے تھے اور اس طرح ہندوستان سے آنے والی فوج
کے لیے تباہ کن رکاوٹ بن سکتے تھے۔ اس وقت تک راستوں کو بند کرنے کا پروگرام محض
کاغذی پلان تھا لیکن اس صورت میں کہ بغاوت سرینگر کی وادی سے شروع کی جائے راستوں
کو بند کرنے سے کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی۔

لہٰذا ہم جو چار ہزار رائفلیں حاصل کرنے والے تھے ان کے متعلق میں نے یہ تجویز پیش
کی کہ ایک ہزار کٹھوعہ روڈ بند کرنے کے لیے اور دو سو سرینگر کے ہوائی اڈے کے لیے دی جائیں
باقی جو دو ہزار آٹھ سو رائفلیں بچیں گی وہ پاکستان کی سرحد کے ساتھ کے علاقوں میں تقسیم
کی جائیں۔

میاں افتخار الدین سرینگر سے واپس آئے تو میں نے انہیں اپنے پلان کی بابت بتا دیا۔
چند دنوں بعد مجھے پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں سے ملنے اور اس پلان کے متعلق
تبادلۂ خیالات کرنے کے لیے لاہور بلایا گیا۔ میں لاہور پہنچا تو سیکرٹریٹ میں سردار شوکت حیات
خان کے ساتھ ابتدائی بات چیت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس مسئلے کو پہلے ہی خاصی توجہ دی جا
چکی ہے اور ایک اور پلان کا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ کانفرنس میں یہ نمایاں تھی کہ جس طرح ہم آزاد

میں دو لوگ آزادی میں بات کرتے ہیں وہاں ایسا انداز ناپید تھا مگر یہ اطمینان ضرور ہوا کہ جو لوگ
کانفرنس میں شریک تھے وہ اس مسئلے میں گہری دلچسپی لے رہے تھے اور پرجوش طریقے سے
اس کام میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں اپنے پلان کی نقلیں دیکھیں مگر مجھے ایسا
شک ہوتا تھا جیسے انہوں نے پلان پڑھا نہیں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ
سردار شوکت حیات خان کے ذہن میں ایک پلان تھا۔

سردار صاحب اپنا پلان اس بنیاد پر بنا رہے تھے کہ سابقہ انڈین نیشنل آرمی کے افسروں
اور جوانوں کی خدمات حاصل کی جائیں اور انہیں مسٹر زمان کیانی کی کمان میں رکھا جائے۔ یہ
لوگ پنجاب کی سرحد پار کر کے جنگی کارروائیاں کریں گے۔ راولپنڈی کے شمال کا سیکٹر مسلم لیگ
نیشنل گارڈ کے ایک کمانڈر میجر خورشید انور کی زیر کمان ہو گا۔ پلان کے مطابق جنگی کارروائیاں دو
سیکٹروں میں ہوں گی اور دونوں کی کمان سردار شوکت حیات کریں گے۔

میں نے اس پلان کو اپنی تجاویز کے ساتھ ملایا اور گلمرگ روڈ اور سری نگر کے ہوائی اڈے
کی اہمیت پر زور دیا۔ سب نے اس تجویز پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہمیں چار ہزار رائفلیں مل رہی ہیں۔
اس کانفرنس میں مجھے کہا گیا کہ مجھے شام چھ بجے گورنمنٹ ہاؤس میں وزیر اعظم لیاقت علی
خان سے ملنا ہے۔

سردار شوکت حیات اور میجر خورشید انور کی چپقلش

میں گیا۔ لیاقت علی خان سے جو کانفرنس ہوئی اس میں کئی اور حضرات کے علاوہ وزیر خزانہ
غلام محمد مرحوم، میاں افتخار الدین، زمان کیانی، خورشید انور اور شوکت حیات خان موجود تھے۔

مجھے توقع تھی کہ اس کانفرنس میں مجوزہ کارروائی پر آخری بحث و تمحیص ہوگی اور نہایت اہم امور کے متعلق فیصلے صادر کیے جائیں گے لیکن یہ کانفرنس صبح والی کانفرنس سے جو سردار شوکت حیات خان وغیرہ سے ہوئی تھی، زیادہ ہی بے ضابطہ اور محض رسمی ثابت ہوئی۔ جوش و خروش اور گرمجوشی تو یہاں بھی تھی مگر سنجیدگی سے کسی مسئلے پر بھی غور نہ کیا گیا نہ کوئی بحث ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ میرے یہاں آنے سے پہلے ان تمام مسائل پر غور و خوض کیا جا چکا ہو جو درپیش تھے۔ میری موجودگی میں رقم کی تقسیم پر زیادہ توجہ دی گئی اور ادھر ادھر کے کچھ نکات پر ہلکے پھلکے سے انداز میں بات چیت ہوئی۔ جنگی نوعیت کی تجاویز اور مسائل اور ان کے اچھے اور برے پہلوؤں پر کوئی بات نہ ہوئی۔ وزیراعظم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں ہر وہ مدد دوں گا جو میرے امکان میں ہے۔ اس کے علاوہ مجھے جو کچھ کہا جائے گا کروں گا۔

جنسی خوشی کے ایسے ماحول میں جس پر عجیب قسم کی خود اعتمادی طاری تھی میں نے کوئی اس قسم کا سنجیدہ مسئلہ پیش کرنے سے گریز کیا کہ ایمونیشن اور مواصلاتی نظام کی ضرورت کس طرح اور کہاں سے پوری کی جائے گی۔ اس کانفرنس کے متعلق افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ جنگی آپریشن کی نوعیت اور مسائل کے متعلق کانفرنس میں کوئی ایک بھی فرد نہیں تھا جو کچھ جانتا ہو۔ وہ جنگی امور سے پورے طور پر ناآشنا تھے۔

کانفرنس کے کمرے سے باہر نکلے تو خورشید انور مرحوم مجھے ایک طرف لے گئے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ سردار شوکت حیات خان کا کوئی بھی حکم ماننے کو تیار نہیں۔ میں نے انہیں یہ ذہن نشین کرانے کی پوری کوشش کی کہ اس وقت مکمل تعاون کی ضرورت ہے اور تعاون کے بغیر حالات بگڑ جائیں گے اس لیے وہ اپنے رویے میں بہتر تبدیلی پیدا کریں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس صورت حال کو کیسے سنبھالوں کہ سردار شوکت حیات خان باہر آئے اور مجھے الگ لے جا کر کہنے لگے کہ انہیں خورشید انور پر ذرہ بھر اعتماد نہیں ہے۔ بداعتمادی کی ایسی فضا کو ختم کرنے کے لیے میں نے سردار شوکت حیات خان سے کہا کہ وہ فوراً لیاقت علی خان سے ملیں اور انہیں کہیں کہ وہ خورشید انور کی جگہ کوئی اور آدمی رکھ لیں مگر سردار شوکت حیات خان بولے کہ خورشید انور انہی کا انتخاب ہے اس لیے اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا بداعتمادی اپنے تمام تر خطرات کے ساتھ شروع میں ہی پیدا ہو گئی سب سے بڑا

خطرہ تھا کہ مرکزیت کو نقصان پہنچے گا۔ یہ خطرات مجھے بُری طرح پریشان کرنے لگے۔ بہرحال اپنے آپ کو اس امید کا قائل کرنا میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ اس تذبذب کے باوجود انجام اچھا ہوگا۔ ہم نے ابھی ابھی انگریز کی صد سالہ غلامی سے نجات حاصل کی اور اپنا وطن بنایا تھا۔ ایک ہی مہینے کے اندر کشمیری مسلمانوں کے اُٹھ کھڑے ہونے کی خبر آئی اور سارے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر جگہ عوام نے جوش و خروش اور جذبے کا مظاہرہ کیا اور وہ خون کی بُو سونگھنے لگے۔ ان حالات میں مجھے بہرحال یہ امید تھی کہ ایک مشترک منزل تک پہنچنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ذاتی اختلافات آگے چل کر ختم کر دیے جائیں گے۔

تیسرا باب

پٹھانوں کا حملہ —

پنجاب پولیس نے ناقص رائفلیں دیں

وزیر اعظم کی اس کانفرنس کے بعد میں راولپنڈی چلا گیا۔ کشمیر میں مسلح بغاوت کی پہلی بار فائر کی جا چکی تھی اور یہ تحریک تیزی سے زور پکڑ رہی تھی۔

اس مرحلے پر کشمیر کے متعلق میری کوئی ذمہ داری نہیں تھی لیکن میں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ ذاتی طور پر جس قدر مدد دے سکا دوں گا۔ میں نے جی ایچ کیو میں بریگیڈیئر شیر خان کو اعتماد میں لے لیا۔ وہ ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر تھے۔ ان کے تعاون سے مجھے وہ تمام اطلاعات اور معلومات مل جاتی تھیں جو فوج کو انٹیلی جنس کے ذریعے حاصل کی جاتی تھیں۔

آرمرڈ کور کے لیفٹیننٹ کرنل مسعود (بعد میں بریگیڈیئر) ٹامی مسعود نے پیش کش کی کہ وہ مجھے اس ایمونیشن کے حصول اور اسے کسی سٹور میں رکھنے کے سلسلے میں مدد دیں گے جسے فوج نے بیکار قرار دے دیا ہے۔ اس ایمونیشن کا تفصیلی ذکر پیچھے کر آیا ہوں۔ بعد میں انہوں نے یہ مدد دی کہ ضرورت کے وقت وہ اس ایمونیشن میں سے زمان کیانی اور خورشید انور کو اتنی مقدار دے دیتے تھے جتنی وہ مانگتے تھے۔ ایئر کموڈور جنجوعہ کی وساطت سے پاکستان ایئر فورس سے بھی مدد ملنے لگی۔ یہ مدد گرم کپڑوں ایمونیشن اور ہتھیاروں کی صورت میں تھی۔ راولپنڈی کے کمشنر خواجہ عبدالرحیم ایک اور جوشیلے انسان تھے جو چندہ، راشن اور ہتھیار جمع کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کشمیر کیلئے رضاکار بھی اکٹھے کیا کرتے تھے۔ شوکت حیات خان اور دوسرے حضرات جب راولپنڈی گئے تو میں انہیں خواجہ عبدالرحیم کے گھر پر ملا تھا۔

پولیس سے چار ہزار رائفلیں حاصل کرنے کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ رائفلوں کی پوری تعداد ان دنوں تک نہیں پہنچی تھی جن کے لیے یہ رائفلیں حاصل کی گئی تھیں۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ پنجاب پولیس نے ان فوجی رائفلوں کی جگہ جو انہیں فوج سے ملی تھیں، فوراً درے کی بنی ہوئی دیسی رائفلیں آگے بھیج دی ہیں۔ یہ رائفلیں بہت ہی گھٹیا قسم کی تھیں جنہیں جلدی ہی بیکار ہو جانا تھا۔ قبائلی علاقے میں جو رائفلیں بنائی جاتی ہیں وہ بظاہر ولایتی رائفلوں کا ہی نمونہ ہوتی ہیں۔ دیکھنے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مگر ان کی نال بہت تھوڑے عرصے میں خراب ہو جاتی ہے۔ لوہا اور دستے کے دیگر حصے بھی کمزور ہوتے ہیں۔ قبائلی پٹھان یہ رائفلیں خود بناتے ہیں لیکن باقاعدہ فوج کے خلاف لڑتے ہیں تو یہ رائفلیں استعمال نہیں کرتے۔ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان دنوں اس رائفل کی قیمت صرف ایک سو روپیہ تھی۔ اس کی بجائے قبائلی اصلی ولایتی رائفل ایک ہزار روپے سے خریدتے تھے۔

درے کی بنی ہوئی یہ رائفلیں جب کشمیر میں استعمال ہوئیں تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ نتائج کیا ہو سکے ہوں گے۔ مجاہدین کے لڑنے کی اہلیت پر بہت ہی برا اثر پڑا۔ یہ دیسی رائفلیں تیزی سے بیکار ہوتی گئیں۔ ہمارے پاس ان کی مرمت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لیے جو رائفل ایک بار بگڑ جاتی تھی وہ ہمیشہ کے لیے بے کار ہو جاتی تھی۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے وعدہ کیا کہ وہ ہمیں اٹلی سے کچھ اسٹین گنیں اور برین گنیں منگوا دیں گے۔ یہ جنگ عظیم کے زمانے سے کسی گودام میں پڑی تھیں۔ ان مشین گنوں کے لیے بہت سا روپیہ صرف کیا گیا۔ جب اٹلی سے دو ماہ بعد مشین گنیں آئیں تو ہم نے دیکھا کہ یہ مشین گنیں نہیں بلکہ اٹلی کی بنی ہوئی سٹین گنیں ہیں۔ مشین گن کے مقابلے میں سٹین گن کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ اس کا زیادہ سے زیادہ فاصلہ دو سو گز ہوتا ہے یعنی صرف دو سو گز تک مار کر سکتی ہے۔ لہٰذا بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ روپیہ بھی ضائع ہوا اور کام کا ہتھیار بھی نہ ملا۔ کشمیر کی جنگ میں سٹین گن محض بیکار تھی۔

اس دوران ہندوستان نے کشمیر میں ایک فریق کی حیثیت سے دل بھی شروع کر دی۔ بھارتی حکومت نے پاکستان پر اس قسم کے الزامات عائد کرنے شروع کر دیے کہ پاکستان کشمیر پر اقتصادی دباؤ ڈال کر اس معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے جو اس کے اور کشمیر کے درمیان ہوا تھا اور یہ بھی کہ پاکستان کشمیر کو اپنے ساتھ الحاق کرنے پر مجبور کر رہا ہے جبکہ ہندوستان

نے اس الزام کی وضاحت میں کہا کہ پاکستان نے کشمیر کی اقتصادی ناکہ بندی اس طرح کی ہے کہ مٹی کا تیل، پیٹرول، اشیائے خورد و نوش اور نمک کشمیر میں لے جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مواصلاتی نظام بھی منقطع کر دیا گیا ہے اور سیالکوٹ اور جموں کے درمیان جو ریل چلتی تھی، وہ بھی روک دی ہے۔

پاکستان کے وزیر خارجہ نے ان الزامات کا جواب دیتے ہوئے وضاحت کی کہ پاکستان نے کسی قسم کی ناکہ بندی نہیں کی۔ کشمیر تک جو مال پاکستان کے راستے جاتا تھا وہ اس لیے نہیں جا رہا کہ ریاست کے اندر کے پُرخطر حالات کو دیکھتے ہوئے ٹرکوں کے ڈرائیور راولپنڈی سے آگے نہیں جاتے چونکہ اس روٹ پر پرائیویٹ ٹرانسپورٹ چلتی ہے اور کوئی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔ اس لیے پاکستان اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے اقتصادی ناکہ بندی کے علاوہ یہ الزام بھی لگایا کہ پاکستان کشمیر کے اندر حملے کروا رہا ہے اور مسلح پارٹیوں کو کشمیر میں داخل ہونے کے لیے اجازت اور مدد دے رہا ہے۔

ان الزامات کی تردید ہندوستان کے حامی کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ نے کر دی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا (اے پی آئی) کے مطابق شیخ عبداللہ نے ۲۱ اکتوبر کے روز دلی میں ایک اخباری بیان میں کہا — "اس وقت ہندوستان کی ریاستوں پٹیالہ، بھرت پور وغیرہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے کشمیر کے مسلمانوں کے دلوں میں قدرتی طور پر ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ کشمیر میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ ریاست کا الحاق ہندوستان سے ہو گیا تو وہ خطرے میں پڑ جائیں گے۔"

شیخ عبداللہ نے اس بیان میں یہ بھی کہا — "پونچھ میں جو ہنگامے بپا ہو گئے ہیں، وہ ریاستی حکومت کی غلط پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ پونچھ کے لوگوں نے مقامی حاکم کے ہاتھوں اور مہاراجہ کے ہاتھوں بہت مصائب جھیلے ہیں۔ انہی مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے پونچھ کے لوگوں نے یہ مسلح تحریک شروع کی ہے۔ اسے فرقہ وارانہ فساد نہیں کہا جا سکتا۔ حکومت نے پونچھ میں فوج بھیجی اس لیے وہاں عوام میں افراتفری مچ گئی۔ پونچھ کے زیادہ تر مسلمان انڈین آرمی کے سابق فوجی ہیں۔ جہلم اور راولپنڈی کے لوگوں کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات بھی ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو سرحد پار پاکستان لے گئے تھے۔ انہیں وہاں چھوڑ کر وہاں کے لوگوں سے ہتھیار لے کے ریاست میں واپس

آ گئے ہیں۔ کشمیر کی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ بعض علاقوں سے ریاست کی فوج کو پسپا کر دیا گیا ہے:

ہماری رائفلیں جواب دے گئیں

اکتوبر ۱۹۴۷ء کے تیسرے ہفتے تک کشمیر کے اندر کی سرگرمیوں کی نوعیت اندرونی بغاوت کی سی تھی جس نے آہستہ آہستہ مگر نمایاں طور پر کامیابی اور مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی کامیابی یہ تھی کہ علاقوں پر علاقے مہاراجہ کی عملداری سے نکلتے جا رہے تھے چونکہ شیخ عبداللہ بھی مہاراجہ کو ہی ملزم سمجھ رہا تھا اس لیے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ ہندوستان سے الحاق کرنے کا فیصلہ کرنے سے گھبرا رہا تھا اور ہندوستان سے مدد لینے کا بھی کوئی موثر بہانہ نہیں مل رہا تھا۔

اچانک صورت حال بالکل بدل گئی جس کی حیثیت انقلاب کی سی تھی۔ یہ انقلابی تبدیلی قبائلی پٹھانوں کی یلغار سے آئی۔ قبائلی ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے روز کشمیر میں داخل ہوئے بس سے ایسی ہنگامی صورت پیدا ہو گئی کہ مہاراجہ نے چار دنوں میں ہندوستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔

مجھے بالکل علم نہیں کہ قبائلیوں کے حملے کا فیصلہ کب کیا گیا تھا اور یہ فیصلہ کس طرح کیا گیا تھا کہ قبائلیوں کا حملہ اس نوعیت کا ہو گا جس نوعیت کا کیا گیا۔ اس سے پہلے میں اسی قدر جانتا رہا تھا کہ خورشید انور قبائلیوں کا لشکر اکٹھا کر رہا ہے۔ بھارت کو قبائلیوں کے حملے کی اطلاع ہماری طرف سے ملی تھی۔ ایک انگریزی کتاب "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" کے انکشاف کے مطابق ۲۴ اکتوبر کے روز ہندوستان کے انگریز کمانڈر انچیف کو پاکستان کے انگریز کمانڈر انچیف نے بذریعہ تار اطلاع دی تھی کہ کم و بیش پانچ ہزار قبائلی پٹھانوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا ہے اور مظفر آباد اور دومیل پر قبضہ کر لیا ہے۔

مہاراجہ نے حکم دیا — "مجھے سوتے میں گولی مار دو"

اب جب کہ ریاست کا الحاق کشمیر سے ہو چکا تھا اور قبائلیوں نے حملہ بھی کر دیا تھا اس

لیے ہندوستان سے مدد اور کمک کا نا گزیر ہو گیا تھا۔ اس کے دو ہی راستے تھے جن کا میں پیچھے تفصیلی ذکر کر آیا ہوں۔ ایک راستہ تو کٹھوعہ روڈ کا تھا جو غیر پختہ تھا اور دوسرا راستہ فضائی تھا جس کے لیے ہوائی اڈہ سرینگر میں تھا۔ میں نے کٹھوعہ روڈ کو بند کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی میں مختلف لوگوں سے کہا کہ جا کر دیکھیں کہ جن ایک ہزار آدمیوں کو رائفلیں دے کر کٹھوعہ روڈ کے ارد گرد مختلف جگہوں پر پوزیشن لینے کے لیے بھیجا تھا اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں یا نہیں۔

کوئی ایک بھی آدمی وہاں موجود نہیں تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ان ایک ہزار آدمیوں کو جو پولیس کی دی ہوئی جو دیسی رائفلیں دی گئی تھیں بیکار ہو چکی ہیں اور یہ تمام کے تمام آدمی پاکستان چلے گئے ہیں ___ اور جو دو سو رائفلیں ان لوگوں کے لیے بھیجی گئی تھیں جنہیں سرینگر کے ہوائی اڈے کے ارد گرد پوزیشن لے کر بھارتی طیاروں کو لینڈنگ سے روکنا تھا، ان آدمیوں کو خورشید انور نے رائفلیں دی ہی نہیں تھیں۔

میں نے بے حد عجلت میں راولپنڈی کے کمشنر خواجہ عبدالرحیم کی مدد سے ایک سو رضاکار جمع کر لیے۔ وہ سب سابق فوجی تھے۔ راولپنڈی سے انہیں سرینگر ہوائی اڈے پر اترنے والے ہندوستانی طیاروں پر فائرنگ کے لیے روانہ کیا گیا۔ ان کا کمانڈر مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا لطیف افغانی تھا۔ انہیں دریائے جہلم پار کرنا اور پہاڑی علاقے کی دشواریاں عبور کرنی تھیں دشمن کی فوجوں کی موجودگی سب سے بڑی دشواری تھی مگر وقت گزر چکا تھا۔ ان کا وہاں پہنچنا بروقت نہیں تھا۔ وہ سرینگر تک پہنچ تو گئے مگر تیس جوانوں کی قربانی دے کر۔ اور پہنچے بھی ایسے وقت جب ہندوستانی فوج کی خاصی نفری اڈے پر اتر چکی تھی اور یہ نفری ہوائی اڈے کے دفاع کے لیے مورچہ بند ہو چکی تھی۔

قبائلیوں کے حملے سے متعلق کچھ چھپ گئیں تھیں۔ ان سے قطع نظر وہ حملہ کامیاب تھا ___ اس سے کہیں زیادہ کامیاب جتنا کہ میں سپاہی کی حیثیت سے ممکن سمجھتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ریاست کی فوج سے مسلمان نکل آئے تھے جس سے قبائلیوں کو "مدد" ملی اور قبائلیوں کو اس سے بھی فائدہ پہنچا تھا کہ ڈوگرہ فوج کا مورال گر گیا تھا اور وہ اتنا اچھا نہیں لڑے جتنا ان سے متوقع تھا۔ پھر بھی قبائلیوں نے جن جنگی چالوں اور لڑنے کی جس اہلیت کا مظاہرہ کیا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کا حملہ توقع سے بڑھ کر کامیاب ہوا۔

قبائلی کشمیر میں پرائیویٹ بسوں میں آتے تھے اور ان کا واحد ہتھیار رائفل تھی۔ ابتداء میں ان کی نفری دو ہزار تھی۔ بہرحال میں نفری کے صحیح اعداد و شمار پیش نہیں کر سکتا۔ انہیں جگہ جگہ اور مختلف اوقات میں جو لڑائیاں لڑنی پڑیں، ان میں سے ہر ایک جگہ اور ہر ایک وقت اس نفری کے چوتھائی حصے کو ہی لڑنا پڑا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ لاریوں میں آگے جاتے تھے اور جہاں مزاحمت ہوتی تھی، وہ لاریوں کو محفوظ جگہ کر کے جنگ کرنے لگتے تھے۔ وہ دراصل حملہ کرتے تھے۔ ان کے حملے کا طریقہ ایسا ہی تھا۔ ریاستی فوج ان سے دہشت زدہ تھی۔ ریاست کی کوئی بھی یونٹ ان سے جم کر نہیں لڑتی تھی بلکہ جوں ہی چند ایک تو ڈوگرے ہلاک یا زخمی ہو جاتے تھے پوری پلٹن پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ قبائلی آگے بڑھ کر اپنے مخصوص انداز سے ان پر حملہ کرتے تھے۔ اس طرح ریاست کی فوج اپنے زخمیوں اور لاشوں کو چھوڑتی پیچھے ہٹتی جا رہی تھی اور قبائلی آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

قبائلیوں کے حملے سے دلی میں جو گومگو کی کیفیت تھی وہ ختم ہو گئی۔ حملے کے تیسرے روز ہندوستانی حکمرانوں نے چیف آف سٹاف کو حکم دیا کہ کشمیر میں فوج بھیجنے کا پلان تیار کریں انہیں توقع تھی کہ مہاراجہ کی اپیل آ ہی رہی ہو گی۔ اسی روز ہندوستانی فوج کے تین سٹاف آفیسر بذریعہ طیارہ سری نگر گئے۔ اگلی صبح جب قبائلیوں نے سری نگر سے چھتیس میل دور بارہ مولا بھی فتح کر لیا تو مہاراجہ نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا مگر فرنٹ کی طرف نہیں گیا بلکہ بوریا بستر سمیٹ کر اپنے دارالخلافے سے بھاگ گیا۔

وہ دو سو میل کا سفر خیریت سے طے کر کے جموں جا پہنچا۔ وہ اس قدر سہما ہوا اور اس کی اعصاب زدگی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ رات سونے سے پہلے اس نے اپنے اے ڈی سی سے کہا کہ اگر صبح تک وی پی مینن ہندوستان سے مدد لے کر نہ پہنچے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم سب کچھ کھو چکے ہیں۔ مہاراجہ نے اپنے اے ڈی سی کو حکم دیا کہ اس صورت میں مجھے سوتے میں گولی مار دینا۔

مہاراجہ کی قسمت میں گولی نہیں لکھی تھی۔ وہ جب اے ڈی سی کو گولی مار دینے کا حکم دے رہا تھا، ہندوستان میں ایک سو فوجی بردار طیارے اگلے روز ہندوستانی فوج کو کشمیر پہنچانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی سارے برصغیر پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا اثر دو حیدرآباد

وہاں کی مسلمان ریاست تک بھی جا پہنچا۔ اسی رات کے تین بجے حیدر آباد کے مسلمانوں کے
ہجوم نے جس کی تعداد بیس اور تیس ہزار کے درمیان تھی، اس وفد کے ارکان کے گھروں کو
گھیر لیا جو وفد کی صورت میں اس مقصد کے لیے دلی جانے والے تھے کہ ریاست حیدر آباد
کا الحاق ہندوستان سے کیا جائے۔ پاکستان میں ہر کسی کی نظریں قبائلیوں کے حملے پر لگی ہوئی
تھیں۔ ابھی پاکستان میں کوئی بھی حتمی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مہاراجہ نے ہندوستان سے
الحاق کے کاغذات پر دستخط کر دیے ہیں یا نہیں

چوتھا باب

ہندوستان کی فوج آ گئی —

پٹھان بارہ مولا میں بیٹھے رہے

۲۸ اکتوبر، ۱۹۴۷ء کی صبح پاکستان کے لوگوں نے ریڈیو سے یہ دو اہم خبریں سنیں کہ کشمیر کا الحاق ہندوستان سے ہو گیا ہے اور ہندوستان نے کشمیر میں فوجی مداخلت شروع کر دی ہے۔ یہ خبریں اچھی نہیں تھیں کیونکہ ایسی صورت حال سے پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے بگڑنے کا خطرہ اور حالات جو پہلے ہی دگرگوں تھے اور زیادہ خراب ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ لاکھوں مہاجرین ہجرت کے دوران بے پناہ مصائب کا شکار ہو چکے تھے۔ پاکستان کے حصے کا فوجی سامان ہندوستان میں رکا پڑا تھا اور جوناگڑھ نے جونہی پاکستان سے الحاق کیا، ہندوستان نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ بہت سے لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ سلسلہ اب رک جائے گا اور کم از کم کشمیر کے متعلق ہندوستان میں عقل اور ہوش سے کام لیا جائے گا اور کشمیر میں جو مسلح بغاوت شروع ہو چکی ہے یہ متعلقہ حکام کو احساس دلا دے گی کہ ریاست کے مستقبل کا صحیح فیصلہ کرنا کس قدر ضروری ہے۔

صاف ظاہر تھا کہ کشمیر کے عوام صرف اس لیے اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کے مہاراجہ نے جسے وہ اپنا نمائندہ نہیں سمجھتے اور جس کے خلاف انہوں نے بغاوت کی ابتدا کر دی ہے، ایک کاغذ پر دستخط کر دیے ہیں، اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ پاکستان کے لوگ اس مسئلے کے متعلق اپنے احساسات اور جذبات سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی وہ اپنے اس فرض کو فراموش کر سکتے تھے جو ان پر کشمیری بھائیوں کی نجات کے لیے عائد ہوتے تھے اس لیے ہر کوئی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کشمیر

نیز، فوجی مداخلت کر کے ہمیں جنگ کے دہانے پر لا رہا ہے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی صبح کی پہلی کرنوں کے ساتھ ہی ہندوستان نے طیاروں کے ذریعے اپنی فوج کی تین سو تیس نفری سرینگر میں اتار دی۔ اس وقت قبائلی پٹھان ابھی بارہ مولا میں تھے بلکہ سارا دن ہندوستان کی فوج سرینگر میں اترتی رہی اور قبائلیوں کا لشکر جو غالباً اس صورت حال سے بالکل بے خبر تھا بارہ مولا میں بے کار پڑا رہا۔ بارہ مولا کے علاوہ ہر جگہ بھارتی فوج کی آمد کی خبر پھیل گئی۔ اس سے غم و غصہ بھی بڑھا اور ہندوستانی فوج کو روکنے کا عزم بھی پیدا ہوا۔

اسی شام آزاد کشمیر کی پہلی حکومت وجود میں آئی جس کے صدر سردار ابراہیم مقرر ہوئے۔ یہ آزاد حکومت کشمیر کے ان علاقوں پر محیط تھی جو آزاد کرائے جا چکے تھے۔ اس لمحے سے جب آزاد کشمیر حکومت کا اعلان ہوا کشمیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ نئی حکومت کو جس اہم مسئلے سے سامنا ہوا یہ تھا کہ اب کشمیر کی آزادی کی جنگ ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے خلاف لڑی جائے گی اور یہ جنگ طویل ہو گی۔

پاکستان میں اسی شام وزیر اعظم نے کشمیر کے ہندوستان سے الحاق سے اور کشمیر میں ہندوستانی فوج کے داخلے سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس پر غور کرنے کے لیے لاہور میں ایک غیر سرکاری کانفرنس طلب کی۔ اس میں دیگر اصحاب کے علاوہ کرنل سکندر مرزا بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل، چوہدری محمد علی وزیر اعظم کے سیکرٹری جنرل، صوبہ سرحد کے وزیر اعظم عبدالقیوم خان، پنجاب کے وزیر اعظم نواب ممدوٹ، بریگیڈیئر شیر خان اور میں شریک ہوئے۔

میں نے اس کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی کہ جموں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس واحد سڑک کو بند کیا جا سکے جس سے ہندوستان کشمیر میں مزید فوج، سپلائی اور کمک بھیجے گا۔ میں نے ایسا مشورہ نہیں دیا کہ پاکستان آرمی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے یا حکومت پاکستان براہ راست اس مہم سے وابستہ ہو جائے۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ قبائلیوں کو اجازت دی جائے کہ وہ جموں پر حملہ کر کے اس علاقے پر قبضہ کر سکیں۔ میرا خیال تھا کہ ایک ہزار نفری کے تین لشکر استعمال کیے جائیں تو کافی ہوں گے۔ میں نے پیش کش کی کہ ان کی قیادت میں خود کروں گا۔

ہندوستان کی فوجی مداخلت سے جموں فوراً ہی نہایت اہم مرکزی نقطہ بن گیا تھا۔ ہندوستان کے لیے کشمیر میں داخل ہونے کا یہی ایک راستہ تھا جو جموں سے ہو کر جاتا تھا۔ ہندوستان سے آنے والی تمام تر کمک کو یہاں جمع ہونا تھا۔ اس اجتماع گاہ سے کمک کو شمال کی طرف بڑھنا، پھیلنا اور جنگ کو طول دینا تھا اور یہیں سے اس ہندوستانی کمک کو مغرب کی طرف بھی جانا تھا جس کے لیے نوشہرہ سے گزرنے والی سڑک تھی۔ اس سے راجوڑی اور پونچھ کے علاقوں میں آزاد کشمیر کو خطرہ تھا۔ اس وقت یہ علاقے مجاہدین کشمیر کے قبضے میں تھے اس کے علاوہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ جانے سے جموں کا فوجی اڈہ جو سیالکوٹ کے سر پر واقع تھا پاکستان کی سلامتی کے لیے شدید خطرہ بن سکتا تھا۔

پاکستانی حکمران جنگ سے ڈرتے رہے

اگر ہم جموں کی ناکہ بندی کر لیتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے ایک سنگین خطرے کو مٹا دیا ہے اور اسے کھلا چھوڑ دینے سے آزاد کشمیر کے مجاہدین کی جنگ آزادی کی مثال اس تالاب کی سی ہوتی جس میں ایک ندی گرتی ہو اور تالاب کو ایک پیالے سے خالی کیا جا رہا ہو۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ قبائلیوں کے لیے جموں پر قبضہ کرنے کا امکان کم تھا لیکن مجھے یہ توقع ضرور تھی کہ ان کے حملے سے مہاراجہ کشمیر جس طرح سری نگر سے بھاگ کر جموں میں پناہ گزین ہوا تھا اسی طرح جموں سے بھی بھاگ جائے گا۔ بہرحال مہاراجہ جموں سے بھاگ جاتا یا وہیں رہتا، البتہ اور بہت سے لوگ قبائلیوں کے حملے سے وہاں سے ضرور بھاگ اٹھتے اور ہندوستان کا رخ کر لیتے۔ اس بھگدڑ سے یہ واحد راستہ تھوڑی سی دیر کے لیے تو ضرور بند ہو جاتا۔ کم از کم ایک دفعہ جموں کے مغرب کے پہاڑی علاقے میں داخل ہو کر قبائلی ہندوستانی فوج کو راجوڑی اور پونچھ کے مرکزی علاقوں تک پہنچنے سے ضرور روک لیتے۔

کانفرنس میں عبد القیوم خان اور نواب ممدوٹ کے سوا کسی نے میری اس تجویز کی مخالفت کی۔ لہٰذا اسے ترک کر دیا گیا۔ سب یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ جموں پر حملے سے ہندوستان مشتعل ہو کر پاکستان پر حملہ کر دے گا۔ ایسا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ہو لیکن ایسی بہت سی وجوہات موجود تھیں جن کی بنا پر ہندوستان حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ قبائلی کشمیر کے اندر اسّی (۸۰) میل تک پہنچ چکے تھے اور وہ پاکستان میں سے گئے تھے۔ ہندوستان کو بھی کا یقین تھا جو بے بنیاد تھا کہ قبائلیوں نے میرپور، پونچھ، کوٹلی، بھاتگرا، نوشہرہ اور بھمبر کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان پاکستان پر حملہ کرنا چاہتا تو اس کے پاس حملے کے لیے معقول بہانے موجود تھے مگر اس نے صرف اس لیے ایسے سنگین اقدام کی نہیں سوچی تھی کہ فوجی لحاظ سے وہ ابھی اتنا طاقتور نہیں تھا۔ اس کی افواج کی تنظیم نو ہو رہی تھی لہٰذا اس کی افواج کھلی جنگ کی تیاری کی حالت میں نہیں تھیں اس کے علاوہ اسے ملک کے اندر کئی مسائل اور پریشانیوں کا سامنا تھا۔ ہندوستانی حکومت کو اس خطرے کا بھی احساس تھا کہ پاکستان پر حملہ کیا تو قبائلی پٹھان مشرقی پنجاب پر یلغار کر دیں گے۔ مشرقی پنجاب کے عوام میں پہلے بارہ مولا کے متعلق مبالغہ آمیز خبروں نے خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ انہیں اس قسم کی خبریں ملی تھیں کہ پٹھانوں نے بارہ مولا پر حملہ کیا تو چودہ ہزار ہندوؤں اور سکھوں میں سے صرف تین ہزار زندہ نکل سکے تھے۔

مگر لاہور میں اس رات جو کانفرنس ہوئی اس میں سوچ بچار کا رخ ادھر ہی تھا کہ ہندوستان کو پاکستان پر حملہ کرنے کا جواز مہیا نہ کیا جائے۔ یہ پیش بینی تو کوئی بھی نہ کر سکا کہ چند ہی ہفتوں بعد قبائلی اپنے طور پر جموں کے محاذ پر لڑ رہے ہوں گے — قبائلیوں نے ایسے ہی کیا مگر کامیابی کا وقت گزر چکا تھا۔ اب حملہ محض بیکار اور نقصان دہ تھا۔ بہرحال کانفرنس میں جن لوگوں نے ہندوستان کے حملے کے خطرے کا اظہار کیا تھا انہوں نے دیکھ لیا کہ قبائلیوں کے جموں پر حملے سے ہندوستان نے پاکستان پر حملہ نہیں کیا — اور چند ماہ بعد پاک فوج کی کئی ہزار باقاعدہ نفری کی ہندوستانی فوج کے ساتھ کشمیر کے اندر ٹکر ہوئی پھر بھی ہندوستان نے پاکستان پر حملہ نہیں کیا — کاش، قبائلیوں کو جموں پر بروقت حملہ کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو کشمیر کا نقشہ آج بہت مختلف ہوتا۔

قائدِ اعظم نے حملے کا حکم دے دیا

قارئین کے لیے یہ انکشاف جو کشمیر کی جنگ کے چند سال بعد ہوا تھا، یقیناً دلچسپ ہو گا کہ اسی رات جس رات پاکستان کے وزیرِ اعظم لاہور میں کانفرنس میں جموں پر حملے کی تجویز مسترد کر رہے تھے، قائدِ اعظم نے حکم دے دیا تھا کہ جموں پر حملہ کر دیا جائے۔ یہ انکشاف ایک برطانوی مصنف ایلن کیمبل نے اپنی کتاب "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" کے صفحہ ۲۲۶ پر کیا تھا۔ اُس وقت پاکستان آرمی کا کمانڈر انچیف برطانوی جنرل مزوری تھا۔ اس کی عارضی غیر حاضری میں قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی تھا۔ ایلن کیمبل نے اپنی کتاب میں قائدِ اعظم کے حکم کے متعلق لکھا کہ قائدِ اعظم کا یہ حکم کہ جموں پر حملہ کیا جائے، ملٹری سیکرٹری کی معرفت جنرل گریسی کو ملا تھا لیکن جنرل گریسی نے جواب دیا تھا کہ وہ سپریم کمانڈر کی منظوری کے بغیر فوج کو ایسا کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ اُس وقت فیلڈ مارشل آکنلیک دونوں ملکوں کی فوجوں کا سپریم کمانڈر تھا اور دلی میں مقیم تھا۔

ایلن کیمبل کے یہ الفاظ کچھ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جنرل گریسی نے قائدِ اعظم کو یہ حکم واپس لینے پر قائل کر لیا ہو گا اور وجوہات یہ پیش کی ہوں گی کہ پاکستان آرمی ابھی منظم نہیں ہوئی اور یہ کہ ایک غیر جانبدار باؤنڈری فورس ابھی تک پنجاب میں موجود ہے اور یہ بھی کہ اگر دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ گئی تو حکومتِ برطانیہ تمام برطانوی افسروں کو واپس بلا لے گی۔

وہ تو جو ہوا سو ہوا، ہم آج اس کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں۔ جموں کو چھوڑ دیا گیا۔ ہم نے تو جموں کو چھوڑ دیا مگر جموں نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ وہاں سے شمالی کشمیر اور مغربی کشمیر میں دھڑا دھڑ بلا روک ٹوک ہندوستان کی فوجیں جاتی رہیں۔ ہم نے جموں سے توجہ ہٹا لی اور اس کی جنگی اہمیت کو نظر انداز کر دیا تو اس سے ہندوستان نے یہ فائدہ اٹھایا کہ

اپنی فوجیں وہاں جمع کرکے طیاروں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فوج سرینگر پہنچاتی اور محاذ مضبوط کر لیتے۔

اس وقت سے ہمارے ذہن میں یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ اگر ہم جموں پر حملہ کرتے تو یہ ایک جوا ہوتا اور ہم پاکستان کے وجود کو بازی پر لگا دیتے۔ میں نے کبھی بھی اس دلیل سے اتفاق نہیں کیا۔ یہ ایک خطرہ ضرور تھا لیکن یہ خطرہ ہم سوچ سمجھ کر مول لے سکتے تھے۔ بہرحال یہ خطرہ تھا جوا نہیں تھا۔ جوئے کی نوعیت کے جوئے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ جیت جاتے ہیں یا ہار جاتے ہیں۔ جیتنے کی صورت میں آپ غیر متوقع حد تک بھی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اور ہارنے کی صورت میں آپ اتنا زیادہ ہار سکتے ہیں کہ آپ کا نام و نشان ہی مٹ سکتا ہے۔ اسے جوا کہتے ہیں۔ فوج کو ایسا جوا اس وقت تک نہیں کھیلنا چاہیے جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ صورت حال اس حد تک دگرگوں ہے کہ شکست ہی شکست ہے۔ ایسی صورت حال میں یا تو بازی لگائی جاتی ہے یا دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس سوچ سمجھ کر خطرہ مول لینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر جیت گئے تو کامیابی توقعات سے بڑھ کر بھی ہو سکتی ہے اور اگر ہار گئے تو پیچھے ہٹنے کے متعلق پہلے سے سوچ بچار کی ہوئی ہوتی ہے اس لیے نام و نشان مٹنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ فوج دوسرا حملہ کرنے کے لیے سنبھل سکتی ہے۔ اسے کہتے ہیں خطرے کا جائزہ لے کر اور سوچ سمجھ کر خطرہ مول لینا۔ تاریخ کے عظیم کمانڈروں نے ایسے خطرے مول لے کر بڑی بڑی طاقتور فوجوں کو شکست دی ہے۔

قبائلی ایمونیشن مانگ رہے تھے۔

ان دلائل کی روشنی میں دیکھتے ہوئے جموں پر ہمارا حملہ جوا نہیں تھا۔ اگر ہم جموں پر قبضہ نہ کر سکتے تو بھی کچھ اور فوائد تھے جو ہم حاصل کر لیتے۔ ہمارے ایک حملے سے جو اگر ناکام بھی ہو جاتا، دشمن زیادہ سے زیادہ فوج کو کشمیر کے دوسرے علاقوں میں بھیجنے کی بجائے جموں میں ہی رکھتا کیونکہ اسے ہر وقت ہمارے دوسرے حملے کا خطرہ لگا رہتا۔ اس

طرح ہم جموں کے لیے ایک مستقل خطرہ بن کر اس کی فوج کی زیادہ تر طاقت کو جموں میں پابند رکھتے۔ اس سے ہماری بہت سی سردردی ختم ہو جاتی اور اگر جموں پر حملے کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو پاکستان کے مٹ جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہی ایک دلیل دی جاتی رہی ہے کہ اس وقت ہندوستان کی فوج ہماری فوج سے دگنی تھی مگر یہ دلیل دینے والے تاریخ کو نہیں دیکھتے۔ قوموں نے اپنے سے کئی گنا طاقتور فوجوں کو بدترین حالات میں شکست دی ہے۔ ایسی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

اگر ہندوستان پاکستان پر حملہ کر بھی دیتا تو وہ پوری فوج کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسے حیدرآباد دکن میں بھی ایک دشمن فوج کی طرف سے خطرہ تھا۔ اگر ہندوستان مشرقی پاکستان کی طرف محاذ کھولتا تو اسے کشمیر سے دستبردار ہونا پڑتا اور ہندوستانی حکمرانوں کو یہی احساس تھا کہ مشرقی پنجاب ہماری زد میں ہے اور ہم کسی بھی وقت مشرقی پنجاب میں دو لاکھ مسلح قبائلی پٹھانوں کا سیلاب چھوڑ سکتے ہیں ہندوستانی حکمرانوں کے لیے اس سیلاب کا تصور ہی ایسا تھا کہ ان کا دماغ معطل ہو جاتا تھا۔

باقی رہا اقوام متحدہ یا عالمی رائے کا خطرہ۔ ہمیں ادھر سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہندوستان پہلے ہی جونا گڑھ پر اسی کیفیت میں جارحانہ قبضہ کر چکا تھا جب یہ ریاست قانونی طور پر پاکستان سے الحاق کر چکی تھی۔ نہ اقوام متحدہ نے کچھ کیا تھا نہ عالمی رائے ہندوستان کا کچھ بگاڑ سکی تھی۔ اسی طرح پاکستان اگر کشمیر میں ایسی کارروائی کرتا تو اقوام متحدہ اور عالمی رائے یقیناً خاموش رہتی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ جموں پر ہمارا حملہ ایک جوا تھا ایک بے بنیاد دلیل ہے۔

بہرحال اس رات وزیراعظم کی کانفرنس میں میری اس تجویز کو مان لیا گیا کہ ایک بریفنگ کمیٹی مقرر کی جائے جو کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کو منظم کرے۔ کانفرنس رات دو بجے ختم ہوئی اور مجھے کہا گیا کہ میں صبح وزیراعظم سے پھر ملوں۔

صبح کے وقت مجھے بتایا گیا کہ میں بریفنگ کمیٹی کا فوجی ممبر ہوں گا۔ کمیٹی کے فرائض سنبھالنے کے لیے مجھے جی ایچ کیو کی ڈیوٹی سے سبکدوش کر دیا گیا اور وزیراعظم کا فوجی

مشیر بنا دیا گیا۔ مجھے راولپنڈی میں رہنا تھا اور میرے لیے لازمی یہ تھا کہ کشمیر کے متعلق اپنی تمام تر سرگرمیوں کو فوج کے انگریز افسروں سے پوشیدہ رکھوں۔ ابھی جی ایچ کیو کے کسی افسر یا جوان کو کشمیر میں عملاً جنگ میں شریک نہیں ہونا تھا۔

برش کمیٹی کے دوسرے ممبر یہ تھے — سردار ابراہیم، خواجہ عبدالرحیم، مسٹر غلام محمد اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا میجر یوسف جسے قبائلیوں سے وابستہ رہنا تھا۔

میں نے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے وضاحت چاہی کہ ہمارا فوجی نوعیت کا کام کیا ہوگا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کشمیر میں تین ماہ تک جنگ جاری رکھی جائے اس سے ہمیں سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے گفت و شنید اور دیگر ذرائع بروئے کار لانے کا وقت مل جائے گا۔

مجھے سب سے زیادہ پریشانی ایمونیشن کی تھی۔ ہم چونکہ جمیوں سے توجہ ہٹا چکے تھے اس لیے ہندوستان وہاں مضبوط فوجی اڈہ اور اسلحہ بارود کا ذخیرہ بنا رہا تھا۔ اب ہمارے مجاہدین کو ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنا تھا جب کہ اس فوج کے پاس ایمونیشن کی کوئی کمی نہیں تھی۔ باقاعدہ فوج کے ہر جوان کے پاس ایک سو راؤنڈ ایمونیشن ہوتا تھا، ایک سو راؤنڈ فی جوان بریگیڈ ریزرو میں ہوتا تھا اور ایک سو راؤنڈ فی جوان ڈویژن ریزرو میں ہر وقت رکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ایمونیشن تیار کرنے والی فیکٹریاں چل رہی تھیں۔

اس کے مقابلے میں اگر ہم قبائلیوں کو ملا کر دس ہزار آدمی جنگ میں بھیجتے اور ہر ایک آدمی کو پورے ایک مہینے کے لیے ایک سو راؤنڈ دیتے تو تین مہینوں کیلئے ہمیں تیس لاکھ راؤنڈ ایمونیشن کی ضرورت تھی اس وقت ہمارے پاس راولپنڈی میں جمع کیا ہوا فقط ۲۰۰۰۰ راؤنڈ تھا جس میں سے آدھا وہ قبائلی مانگ رہے تھے جو سرینگر کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے — ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام میں بہت جلدی میں یہ دیکھنے کے لیے راولپنڈی پہنچا کہ قبائلیوں نے جو ایمونیشن مانگا تھا وہ انہیں مل گیا ہے یا نہیں۔

پانچواں باب

قبائلی سرینگر تک پہنچ گئے

اگلی صبح جو ۲۹ اکتوبر کی صبح تھی، میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے سرینگر روانہ ہوا۔ میرے ساتھ اخباری نمائندہ علی اختر مرزا بھی تھا۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہم کوہالہ کے مقام پر کشمیر کی سرحد میں داخل ہوئے تھے۔ دن کے وقت میں کشمیر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ ہندوستانی طیارے دن بھر فضا میں منڈلاتے رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے سڑک ویران رہتی تھی۔ ہم شام کو وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لوگ ادھر اُدھر گھومنے پھرنے لگے تھے۔ مگر سرگرمی ابھی عروج پر نہیں پہنچی تھی۔ بیس میل تک ہم نے سفر خاموشی سے طے کیا۔ دریائے جہلم ہمارے بائیں طرف تھا اور دائیں طرف پہاڑیاں تھیں جن پر شام کا دھندلکا چھاتا چلا جا رہا تھا۔ کوہالہ سے اتنی دور آگے کوئی انسان نظر نہیں آرہا تھا۔ دور دور جھونپڑے نظر آتے تھے مگر روشنی کہیں نہیں تھی۔ کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ماحول چپ چاپ تھا۔ جنگ کے کوئی آثار نہیں تھے بلکہ ماحول اور فضا میں پُراسرار سا سہما ہوا پن اور سکوت تھا۔

ہم مظفر آباد پہنچے تو منظر اس طرح یکلخت بدل گیا جیسے کسی نے پردہ اٹھا دیا ہو — قبائیلیوں کے قافلے سرینگر کی طرف جا رہے تھے۔ یہ منظر ایسا تھا جیسے کسی نے تاریخ کا ایک ورق پلٹ کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہو۔ میرا ذہن کئی صدیاں پیچھے چلا گیا جب ہمارے آباؤ اجداد سرحد کے کوہساروں، وادیوں اور دروں سے گزر کر آیا کرتے تھے۔ ۹۰

اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام مجھے وہی منظر نظر آ رہا تھا، ویسی ہی پہاڑیاں تھیں، ویسا ہی جذبہ تھا۔ عزم بھی آباؤ اجداد جیسا تھا۔ یہ قبائلی مجھے اپنے آباؤ اجداد کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ان کا لباس، ان کا انداز صدیوں پرانا تھا اور وہ اپنے دادا پردادا کی طرح ان دیکھے، اجنبی دیس کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ صدیوں پہلے وہ پیدل چلتے تھے یا گھوڑوں پر آتے تھے۔ اب وہ گنوارے میں جا رہے تھے مگر یہ ایسا گنوارہ تھا جسے کسی نے منظم نہیں کیا تھا۔ کوئی اس کا کمانڈر نہ تھا۔ کشمیر کے اندر، مظفرآباد میں بے شمار لوگ اکٹھے ہو گئے تھے کیونکہ انہیں کشمیر کے دارالخلافے سرینگر تک جانا تھا جہاں تک صرف ایک سڑک جاتی تھی اور اس کے لیے مظفرآباد جانا ضروری تھا۔

ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کا تیسرا دن تھا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلیوں نے چھ روز پہلے اسی مقام سے کشمیر پر حملے کا آغاز کیا تھا۔ ان کے حملے کے چوتھے روز (۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء) کشمیر کا مہاراجہ دارالخلافے سے بھاگ گیا تھا۔ اگلے ہی روز ہندوستان نے فوجی مداخلت کی تھی اور اس کی فوجیں طیاروں کے ذریعے سرینگر میں اترنی شروع ہوئی تھیں۔

اب قبائلیوں کی مزید نفری جنگ آزادی میں شریک ہونے کے لیے سرینگر کی سمت جا رہی تھی۔ لاریاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ کسی لاری میں چالیس پٹھان سوار تھے، کسی میں پچاس اور بعض میں تو ستر ستر ٹھنسے ہوئے تھے۔ لاریوں کے باہر بھی آدمی لٹک رہے تھے، چھتوں پر بھی بیٹھے تھے اور انجنوں پر بھی۔ ان میں نوجوان بھی تھے اور سفید داڑھیوں والے بوڑھے بھی۔ ان میں شاید ہی کوئی اچھے کپڑوں میں ملبوس ہو۔ اکثریت پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی اور بعض کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے لیکن ان کے چہرے مہرے اور قد و قامت میں جاذبیت تھی۔ وہ خوبرو تھے، پرکشش تھے اور ان کی آنکھوں میں حریت کی تڑپ اور چمک تھی۔

ان کے ہتھیار مختلف النوع تھے۔ کسی کے پاس برطانوی رائفلیں تھیں، کسی کے پاس فرانسیسی، بعض کے پاس جرمنی کی بنی ہوئی رائفلیں تھیں اور بہت سے ایسے تھے جو سرحد کی بنی ہوئی دیسی رائفلیں اٹھائے ہوئے تھے۔ ایسے بھی تھے جن کے پاس لمبی اور چھوٹی نال والے پستول تھے اور کچھ شکاری بندوقوں سے مسلح تھے —— اور ان

میں ایسے افراد بھی تھے جن کے پاس خنجر کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ وہ اسلحہ کے بغیر ہی
لڑنے جا رہے تھے۔ کہتے تھے کہ اسلحہ دشمن سے لے لیں گے۔

ان کی ٹرانسپورٹ بھی رنگا رنگ تھی۔ اچھی قسم کی بسیں بھی تھیں، پرانی قسم کی لاریاں
بھی اور کوئی بھی چیز جس کے نیچے چار پہیے اور اس میں سڑک پر لڑھکنے کی طاقت تھی پٹھان
قبائلیوں کے کنوائے میں شامل تھی۔ میں نے اس میکانکی قافلے میں ایک ایسی کار بھی
جس کی چھت نہیں تھی، بتیاں نہیں تھیں، بریکیں بھی مشکوک تھیں اور یہ ایک کار کی طرح
کا ڈھانچہ تھا جو چار پہیوں پر چلا جا رہا تھا۔ اس پر نو آدمی سوار تھے اور اس پر جھنڈا لگا
ہوا تھا —— اس پرچم بردار کار نما شے میں سوات کی باقاعدہ فوج کا ہیڈ کوارٹر جا رہا تھا
اس قافلے کی رفتار بہت سست تھی۔ صدیوں پرانے انجن اپنی طاقت سے کہیں زیادہ بوجھ
بڑی مشکل سے گھسیٹ رہے تھے۔ منزل بہت دور تھی جہاں تک اس رفتار اور ایسے
قدیم انجنوں سے پہنچنے کے لیے طویل مدت درکار تھی۔ بعض گاڑیوں کے متعلق تو وثوق سے کہا
جا سکتا تھا کہ منزل پر کبھی بھی نہیں پہنچ سکیں گی لیکن ان آدمیوں کو جو ان میں سوار تھے کوئی
پرواہ نہیں تھی کہ گاڑیاں منزل پر پہنچیں نہ پہنچیں۔ انہیں اپنے متعلق اعتماد تھا کہ وہ منزل کو جا
لیں گے خواہ کسی بھی ذریعے سے پہنچیں۔ وہ لڑنے آئے تھے۔ ان کی رگوں میں جو خون رواں
رواں تھا اس خون میں صدیوں پرانی روایات رچی بسی ہوئی تھیں —— مظلوم، ہم جولی اور
خلافت سے بزور آزمائی سے بھرپور روایات! وہ منزل پر پہنچنا جانتے تھے، دشواریوں پر غالب
آنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ وہ ان وقیانوسی وادیوں کے تاراج اور پابند نہیں تھے۔ ان کا
جوش اور جذبہ عروج پر تھا۔ لاریوں کے بے ہنگم شور و غل اور واویلے میں قبائلیوں کے جنگی
ترانے اور ڈھول کی تھاپ صاف اور بلند سنائی دے رہی تھی۔ وہ جنگی ترانے گاتے اور
ڈھول بجاتے جا رہے تھے۔

کشمیر کی شام جوش و خروش سے مرتعش ہو رہی تھی۔ وہ ان شاموں میں سے ایک تھی
جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی کیونکہ ایسی شام کے بطن سے آزادی کے اجالے
جنم لیا کرتے ہیں۔ پٹھانوں کا جنگجو قافلہ سرینگر کی بلندیوں کی طرف عظمت کی بلندیوں کی سمت
چلا جا رہا تھا۔

کاش! خورشید انور یوں نہ کرتا

ہم جلدی میں تھے۔ اس کھوتے کی رفتار سے ہم تو نہیں جا سکتے تھے۔ سڑک پر کھوتے کا قبضہ تھا۔ ہم نے بڑی ہی مشکل سے راستہ بنایا اور کچھ دیر اور وقت کے بعد ہی ہمیں کھلی سڑک ملی۔ مظفر آباد سے پچاس میل دور اوڑی کے مقام پر پل ٹوٹا ہوا پایا۔ یہ ریاست کشمیر کی فوج نے مظفر آباد سے پسپا ہوتے ہوتے تباہ کیا تھا۔ تھوڑے ہی دن پہلے قبائلیوں نے مظفر آباد پر حملہ کیا تھا۔ مہاراجہ کی فوج جم نہ سکی اور پسپا ہو گئی۔ قبائلی تعاقب میں تھے۔ اسی لیے ڈوگروں نے یہ پل توڑ دیا تھا۔ وہاں کے مقامی لوگوں نے پٹھانوں کی مدد اس طرح کی کہ پہاڑ کاٹ کر ایک میل لمبا متبادل راستہ بنا دیا تاکہ پٹھان پیچھے بھاگتے ڈوگروں کو جا لیں۔

ہم نے بل کھاتی سڑک پر مزید تیس میل طے کر لیے اور مظفر آباد سے اسی میل دور پہنچ گئے۔ اب ہم پہاڑیوں سے نکل گئے تھے اور بارہ مولا میں تھے جو وادیٔ کشمیر کا دروازہ ہے۔ بارہ مولا باغوں اور سیبوں کا شہر ہوا کرتا تھا۔ وہاں بس سٹیشن بھی تھا اور دریائی ٹرانسپورٹ کا سٹیشن بھی۔ دکانوں اور چھوٹے بڑے ہوٹلوں نے یہاں نرالی سی رونق بنا رکھی تھی۔ بارہ مولا میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔ بڑی دل کش اور خوشگوار جگہ تھی۔ مگر ہم وہاں پہنچے تو ایسے لگا جیسے ہولناک زلزلے نے اسے تباہ و برباد کر دیا ہو۔ یہ تو حسین و جمیل شہر کا ڈراؤنا بھوت تھا۔ پُر رونق شہر کی بدروح تھی۔ دکانیں خالی، ہوٹل ویران، ان کے مالک بھی نہیں تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑ غائب۔ سڑکوں پر اور ہر طرف اینٹیں، پتھر اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ یہ تباہی دونوں فریقوں نے مچائی تھی۔ پہلے مہاراجہ کی فوج نے پسپا ہوتے ہوئے مکانوں اور دکانوں کو بارود اور گولوں سے تباہ کیا تاکہ قبائلیوں کے راستے مسدود ہو جائیں۔ پھر قبائلی طوفان کی طرح آئے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ آخر انڈین ایئر فورس نے شہر پر بموں اور راکٹوں کی بارش برسا کر تباہی مکمل کر دی۔ کہیں کہیں آگ لگی ہوئی تھی۔ ہم وہاں کا جائزہ لینے کے لیے رک گئے اور ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگے۔ بڑی سڑک سے ہٹ کر شہر کا جو حصہ تھا وہ زیادہ تباہ نہیں ہوا تھا۔ وہاں کے رہنے والے بہت سے لوگ ابھی وہیں تھے۔

قبائلی یہاں ۲۶ اکتوبر کے روز پہنچے تھے۔ اس روز تک مہاراجہ نے ریاست کا الحاق کشمیر سے نہیں کیا تھا اور ہندوستان کی فوجیں ابھی آنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ ریاست کی فوج کے حوصلے بالکل ہی ختم ہو گئے تھے۔ اسی لیے وہ بڑے ہی غیر منظم طریقے سے پسپا ہوتی تھی۔ یہاں سے قبائلیوں کے سامنے پینتیس میل کی مسافت تھی اور ان کے راستے میں دشمن کی کوئی مزاحمت نہیں تھی۔ دشمن بھاگ رہا تھا۔ قبائلیوں کے سامنے سرینگر تھا۔ اس وقت سرینگر کی کیفیت یہ تھی جیسے خوف سے کانپ رہا ہو۔ مہاراجہ کا دارالخلافہ قبائلیوں کے رحم و کرم پر تھا مگر قبائلیوں نے نہ اس روز بارہ مولا سے آگے پیش قدمی کی نہ اگلے روز۔ آخر ۲۸ اکتوبر کے روز انھوں نے سرینگر کی سمت کوچ کیا مگر اب ان کے راستے میں ہندوستان کی باقاعدہ فوج حائل ہو چکی تھی جو ایک سو طیاروں پر ایک ہی روز پہلے سرینگر میں اتری تھی۔

ہندوستان کی فوج کے ساتھ قبائلیوں کا مقابلہ بارہ مولا سے دس میل دور ہوا۔ قبائلی ہندوستانیوں پر غالب آ گئے لیکن ایک پورا دن ضائع ہو گیا۔ ۲۹ اکتوبر کی شام سرینگر کی طرف پیش قدمی کے قابل ہو سکے۔ اب وہ سرینگر تک پہنچ چکے تھے۔ ہم چند گھنٹوں میں ان تک پہنچنے والے تھے۔ ہمارے پیچھے جو قبائلی آ رہے تھے وہ کمک تھی جو سرینگر جا رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ انھوں نے بارہ مولا میں دو دن کیوں ضائع کیے؟ اگر یہ دو دن ضائع نہ کیے جاتے تو آج کشمیر کی کہانی بالکل ہی مختلف ہوتی۔ مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ قبائلی خود ہی دو دن بارہ مولا میں رکنا چاہتے تھے۔ شاید زخمیوں کو پیچھے بھیجنے کے لیے وقت درکار ہو لیکن اس کام میں اتنا وقت نہیں لگنا چاہیے تھا۔ یا وہ کمک کے انتظار میں بیٹھے رہے ہوں۔ نہیں یہ تو معلوم تھا کہ اس وقت رفتار کی ضرورت تھی۔ بارہ مولا میں تو ان کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ جب ان کے سامنے سرینگر جیسا شکار موجود تھا جو پکا تھا۔ سرینگر تھا اور سرینگر دور بھی نہیں تھا۔ دشمن بھاگ رہا تھا۔ راستہ بھی صاف تھا۔

میرے لیے اور کشمیر کی جنگ آزادی کے لیے یہ سوال بہت اہم تھا۔ میں اس کا جواب ڈھونڈنے لگا۔ بار بار یہ خیال آتا کہ ان قبائلیوں کا کمانڈر میجر خورشید انور تھا۔ اس

نے ضرور کسی معقول وجہ کی بنا پر دونوں کے لیے تعاقب ملتوی کر دیا ہوگا۔ آخر مجھے جواب مل گیا۔ بارہ مولا کے رہنے والے بہت سے مسلمان وہاں موجود تھے۔ میں نے ان میں سے چند ایک معتبر اور ذمہ دار افراد سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ ان قبائیلوں کا کمانڈر میجر خورشید انور تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ سرینگر پر قبضہ کر لے گا۔ اس نے بارہ مولا میں پیشقدمی روک دی اور کشمیری لیڈروں کو بلا بھیجا۔ وہ ان کے ساتھ طے کرنا چاہتا تھا کہ کشمیر کی حکومت میں اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ وہ یہاں لیڈروں کا انتظار کرتا رہا۔ اس انتظار کے دوران ہندوستانی فوج آ گئی اور سرینگر کے راستے میں باقاعدہ مورچہ بند ہو گئی۔

مجھے بارہ مولا میں ہی آدھی رات ہو گئی۔ فرنٹ تک پہنچنا تھا۔ ہم بارہ مولا سے نکلے سڑک پر کوئی ٹریفک نہیں تھی۔ راستے میں کئی ایک گاؤں آئے۔ بعض میں کچھ آدمی چوروں کی طرح ادھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے اور خالی مکانوں سے سامان لوٹ رہے تھے۔ ہمیں ابھی تک لڑائی کے کوئی آثار نہ ملے۔ نہ کوئی فائرنگ تھی اور نہ کوئی جنگی سرگرمی۔ یہ بھی سراغ نہیں ملتا تھا کہ محاذ کہاں ہے۔ وہاں کوئی بتانے والا ہی نہیں تھا۔ ہمیں اتنا ہی معلوم تھا کہ لڑائی اوپر کے پہاڑی علاقے میں ہو رہی ہے۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ اس سڑک پر دشمن کا ہی قبضہ نہ ہو۔ بہر حال تصدیق یا تردید کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان خدشات کے پیشِ نظر ہم نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کر لی اور بتیاں بجھا دیں۔

سرینگر کے دروازے پر

دس میل آگے گئے تو ایک جگہ الاؤ جلتا دیکھا۔ کچھ قبائلی اس کے گرد سوئے ہوئے تھے۔ پانچ میل اور آگے گئے تو ہمیں سڑک کے ساتھ ساتھ چند ایک انسانوں کے سیاہ بُت سے چلتے پھرتے نظر آئے۔ ہم ان کے قریب سے گزر گئے۔ ہماری گاڑی کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ کشمیر جنگ کی لپیٹ میں تھا مگر رات بالکل خاموش تھی۔ نصف گھنٹہ گزرا تو دور سے ہمیں سرینگر کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں

فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اب ہم محاذ کے قریب تھے۔ ذرا اور آگے گئے تو ہم نے دیکھا کہ زخمیوں کو پیچھے لایا جا رہا تھا۔ دو تین فرلانگ اور آگے گئے تو دیکھا کہ ہندوستانی توپوں کے گولے سڑک پر پھٹ رہے تھے لیکن دوسری فائرنگ کم ہو رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ حملہ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ ہم رک گئے۔ یہ چوتھا سنگ میل تھا یعنی ہم سرینگر سے چار میل دور تھے۔ یہاں سے سرینگر کے مضافات شروع ہوتے تھے۔ اس سنگ میل پر دشمن نے سڑک مختلف رکاوٹوں سے بند کر رکھی تھی۔ سڑک کے دائیں بائیں کی زمین کہیں کھیتی اور نشیب و فراز والی تھی۔ یہ نئے وہاں سے جو معلومات فراہم کیں ان سے پتہ چلا کہ قبائلی سڑک سے ہٹ کر اور رینگ رینگ کر آگے بڑھے تھے۔ دشمن نے تمام علاقے میں اندھا دھند فائرنگ جاری رکھی جس سے قبائلیوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ قبائلی خاموشی سے آگے ہی آگے بڑھتے گئے تھے۔ مگر آخری چند سو گز رہ گئے تو صورت حال بالکل ہی بدل گئی جس سے قبائلی پہلے سے آگاہ نہیں تھے۔ سرینگر سے باہر کے علاقے میں پانی ہی پانی تھا۔ دھان کے کھیت تھے جن میں پانی تھا۔ جھیلیں تھیں۔ بارش کا پانی بھی جگہ جگہ جمع تھا اور دلدل بہت تھی۔ قدرت نے سرینگر کا دفاع مضبوط بنا رکھا تھا۔

قبائلی دشمن کی پوسٹ پر ہلہ بولنے کے لیے جا رہے تھے مگر پانی اور دلدل سے بچ بچ کر بڑھنے کی کوشش میں پوسٹ سے ہٹ کر سڑک کے قریب آتے جا رہے تھے۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ سڑک کے راستے ہی دشمن کی پوسٹ پر سامنے سے جا کر ہلہ بول دیں اور سرینگر میں داخل ہونے کے لیے راستہ صاف کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسی ہی دلیرانہ کارروائی کی۔ اگر قبائلی محسودوں اور وزیریوں جیسے تجربہ کار ہوتے تو ایسا حملہ کبھی نہ کرتے۔ وہ مہمند تھے جو اس قسم کی لڑائی کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ وجہ بھی تھی کہ جس دلیرانہ حملے سے وہ دشمن کو منتشر کرتے یہاں تک دھکیل لائے تھے اس سے ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرینگر کے دفاع سے ٹکرانے کے صحیح طریقے اور خطرے کو خاطر میں نہ لائے۔ انہوں نے دشمن کی پوسٹ پر سامنے سے ہلہ بولا اور دشمن کی مشین گنوں اور رائفلوں نے انہیں بھون کے رکھ دیا۔ اس فائر میں مارٹر گنوں کا فائر بھی تھا۔ حملہ ناکام ہو گیا — رات گزر گئی تھی۔ سحر طلوع ہونے کو تھی اس لیے کوئی مزید کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی۔

صبح کے چار بج رہے تھے اور یہ ایسا وقت تھا جب ہمیں چھپنے کی جگہ ڈھونڈنی تھی۔
صبح کا جالا نکھرتے ہی ہم دشمن کی فوج کو بھی نظر آسکتے تھے اور ہوابازوں کو بھی۔ انڈین
ایئر فورس کے طیارے صبح ہوتے ہی فضا میں آجاتے تھے۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں
سے ذرا پیچھے ہمیں چنار کے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ گاڑی اس میں چھپا کر ہم آرام کرنے
کی کوشش کرنے لگے لیکن نیند کے لیے کوئی وقت نہیں رہ گیا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد صبح
طلوع ہوگئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت کے بڑے ہی حسین منظر سے پردہ اٹھ رہا ہو۔
یہ ایک سرد اور شفاف صبح تھی۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف چمک رہی تھی۔ پرندے چہچہا رہے
تھے۔ سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ ہی مرغابیوں اور کونجوں کے غول نہایت اچھی ترتیب
میں اڑتے نظر آنے لگے۔ سورج کی کرنوں سے ان کے پروں کے رنگ چمکتے تھے تو
قدرت کا حسن اور زیادہ نکھرا نکھرا لگتا تھا۔ زمین پر ابھی دھند تھی۔ ہر سو خاموشی تھی سوائے
ایک ندی کے بہاؤ کے ہلکے ہلکے مترنم شور کے جو قریب ہی بہہ رہی تھی۔ سورج اور اوپر
اٹھا تو کھیتوں اور چناروں کی ہریالی شفاف نیلے آسمان تلے طلسم طاری کرنے لگی۔ ماحول
اس قدر پرسکون تھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ اس روح پرور ماحول میں جنگ لڑی جا رہی
ہے۔ چند گھنٹے پہلے کے واقعات ماضی بعید کی واردات معلوم ہوتے تھے۔
منظر یہ سحر اور یہ راحت پرور فضا کچھ دیر کی مہمان ثابت ہوئی۔ ایک ہندوستانی لڑاکا
طیارہ گرجتا غراتا، زناٹے سے ہمارے اوپر سے گزر گیا۔ وہ تمام علاقے پر کچھ دیر تک منڈلاتا پھر
اس نے درختوں کا جو بھی جھنڈ دیکھا اس پر بم گرایا یا مشین گن فائرنگ کی۔ وہ نظروں سے
اوجھل ہوا ہی تھا کہ دوسرا طیارہ آگیا۔ اس نے بھی کہیں بم گرائے اور کہیں مشین گنیں فائر
کیں۔ ماحول لرزنے لگا اور کشمیر کا حسن بموں کے مہیب دھماکوں سے سہم گیا۔ یہ طیارہ
آگ برسا کر گیا تو ایک اور آگیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ دن بھر لگا رہے گا۔ جابجا بڑے
اطمینان سے بمباری اور مشین گن فائرنگ کر رہے تھے۔ نیچے سے ان پر کوئی فائر نہیں کر رہا تھا
وہ آسمان اور فضا میں آزاد تھے۔ وہ بہت ہی کم بلندی پر اڑ رہے تھے اور کبھی کبھی تو وہ درختوں
کی بلندی سے بھی نیچے آجاتے تھے۔
میں نے ٹھنڈے یخ پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ سفری ناشتہ کیا اور چھپ چھپ کر جائزہ
لینے لگا کہ سرینگر کا کیا حال ہے۔ دن کی روشنی میں کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی طیارے

کی موجودگی میں جنگی کارروائی ممکن نہیں تھی۔ میری طرح چند اور آدمی ادھر اُدھر حرکت کرتے نظر آتے تھے۔ چند ایک آدمی ادھر اُدھر چھپ چھپا کر طیاروں کو جل دے سکتے تھے۔ کھلے علاقے میں انسان طیارے کو دیکھ سکتا ہے۔ اور اسے چھپنے کا خاصا وقت مل جاتا ہے اور اگر ہوا باز کسی ایک آدمی کو دیکھ بھی لے تو وہ اسے مارنے کے لیے اتنا ایمونیشن ضائع نہیں کرے گا۔ اور اگر ہوا باز اس آدمی کو مارنا چاہتا ہے تو بھی آدمی اس سے صاف بچ سکتا ہے کیونکہ طیارہ سیدھا غوطہ لگاتا ہے۔ اپنی مشین گنوں کو گھما نہیں سکتا۔ اسے پہلے تو حملے کے لیے نیچے آنا پڑتا ہے، پھر نشانہ لینا ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں آدمی چھپ جاتا ہے۔

میں چند گھنٹے ادھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا اور ہندوستانی ہوا بازوں کو دھوکا دیتا رہا۔ میرے پاس نقشہ تھا اور دوربین بھی تھی۔ میں نے دونوں کی مدد سے زمین کا جائزہ لے لیا۔ ہماری طرف سے سرینگر میں داخل ہونے والے تمام راستے پانی میں ڈوبے ہوتے تھے۔ یہ پانی کچھ کم ہو گیا تھا پھر بھی سڑک تک یا کسی پگڈنڈی تک یا کسی بند تک پہنچنے کے لیے یہ پانی ابھی دشوار اور رکاوٹ تھا۔ دشمن کی نظر اور اس کے ہتھیاروں کی زد سے کوئی بھی راستہ محفوظ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ دشمن کی پوزیشنوں پر حملہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک عقب سے ہوائی جائزہ نہ لے۔ تاہم سرینگر کی پوزیشن خاصی کمزور تھی۔ ریاستی فوج کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور اندر کے مسلمان اس فوج کے دشمن تھے۔ ہندوستانی فوج کی جو نفری اس وقت تک سرینگر میں اتری تھی بمشکل تین بٹالین تھیں۔ سرینگر کے دفاع پر پیریمیٹر کے لیے جو کئی میل لمبا اور بے قاعدہ سا تھا یہ نفری کافی نہیں تھی۔ ان کی پوزیشنیں کم تھیں اور اتنی دور دور کہ ایک دوسری کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا اس روز سرینگر کا دفاع کوئی ایسا مستحکم نہیں تھا کہ توڑا نہ جا سکتا۔ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ حالانکہ فضا میں طیارے اڑ رہے تھے اور ہندوستان کی فوج بھی موجود تھی پھر بھی قبائلی پٹھان پیریمیٹر اور ہوائی اڈے کے اردگرد آزادی سے گھوم پھر رہے تھے۔

مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک بار قبائلی شہر کے اندر چلے جاتے تو انہیں نکالنا مشکل ہو گا۔ شہر والوں کی بھگدڑ اور افراتفری اور فوجوں کی بھاگ دوڑ سے سڑکیں بند ہو جائیں گی۔ ریاستی فوج تو دل چھوڑ بیٹھی تھی۔ اس کا کوئی ڈر نہ تھا جہاں تک ہندوستانی فوجوں کا تعلق تھا انہیں زیادہ تر ہوائی اڈے کا دفاع کرنا تھا کیونکہ انہیں اسی راستے سے ہندوستان کو بھاگنا تھا — لیکن سرینگر

میں داخل ہونے کی کیا صورت ہو؟
ایک ہی صورت تھی کہ رات کے وقت کشتیوں سے پانی کی گہری کھاڑیاں عبور کی جائیں
اور جہاں پانی کم ہو وہاں سے پیدل چل کر گزر جایا جائے۔ اس صورت میں وہاں کے رہنے والے
لوگوں کی مدد کی ضرورت تھی۔ قبائلی اب یہی طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے مگر جنگ کی
وجہ سے اس علاقے کے رہنے والے وہاں سے چلے گئے تھے جبکہ کشتیوں اور گائیڈ
کے حصول کے لیے بہت وقت درکار تھا۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کتنا وقت لگ جاتے مگر
ہر ایک دن جو ضائع ہو رہا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرینگر میں اترنے والی ہندوستانی فوج میں
اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ صورت بہت ہی خطرناک تھی لیکن یہی ایک ترکیب رہ گئی تھی جسے فوری طور پر
آزمانا ضروری تھا مگر اس پر عمل بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

پاکستان دو بکتر بند گاڑیاں بھی نہ دے سکا

دن میں نے بغور اس سڑک پر غور کیا جسے رات کے حملے میں استعمال کیا گیا تھا۔ سڑک
کے سامنے دشمن کی دفاعی پوزیشن زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ وہاں کنکریٹ کے مورچوں اور
بنکروں کے ہندقوں یا ناقابلِ تسخیر رکاوٹوں کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ توپوں کا آنا تھا
گولہ اور مارٹر یا دشمن کا فائر جو پیدل ٹولے کے آدمیوں یا ادویوں کو تو روک سکتا تھا اس سے
مضبوط چیز کو روکنے کے قابل نہیں تھا صرف ایک بکتر بند گاڑی اس رکاوٹ سے بخوبی
گزر سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ دو بکتر بند گاڑیاں کافی ہوں گی اور یہ دو گاڑیاں پاکستان سے
یہاں چوبیس گھنٹوں میں پہنچ جائیں گی۔ اب کرنے والا کام یہ تھا کہ میں جس قدر جلد ممکن ہو
سکے واپس جاؤں اور دو بکتر بند گاڑیاں لے آؤں۔
جب سورج غروب ہو گیا اور طیاروں کا خطرہ ٹل گیا تو میں واپسی کے لیے روانہ ہوا۔
ایک تو رات کا وقت تھا اس کے ساتھ بارش کیچڑ اور قبائلیوں کی ترغیب نے میری رفتار
تیز تر نہ ہونے دی۔ مجھے بہت کوفت ہو رہی تھی لیکن یہ خیال مجھے مسرور کر رہا تھا کہ ہندوستانی
فوج میں اضافے سے پہلے میں دو بکتر بند گاڑیاں لے کے پہنچ جاؤں گا۔ گو مجھے یہ بھی معلوم
تھا بکتر بند گاڑیاں حاصل کرنے کے لیے مجھے چند ایک اعتراضات کا جواب دینا پڑے گا۔
مجھے کہا جاتے گا کہ پاکستان آرمی کی بکتر بند گاڑیاں استعمال ہوئیں تو ہندوستان اسے

پاکستان کی فوجی مداخلت قرار دے گا۔ ہندوستان ہمیں پہلے ہی حملہ آور گردانتا تھا۔ اس نے ہم پر یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ قبائلیوں کو ہم کشمیر لے گئے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان الزامات کے بعد اگر دو گاڑیاں پاکستان سے آگئیں تو کیا فرق پڑ جائے گا؟

یہی دلیل دی جاتی تھی کہ دو بکتر بند گاڑیاں بھیجنے سے پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جائے گی۔ مجھے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ دونوں ملکوں میں سے کوئی بھی جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس حقیقت سے انکار یا فرار ممکن نہیں تھا کہ ہم کشمیر میں الجھے ہوئے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ دونوں ملک جنگ کھیلنا نہیں چاہتے۔ دونوں نوزائیدہ مملکتیں تھیں جن کی عمر ابھی تین مہینے ہوئی تھی۔ ابھی تو وہ ٹھیک سے سنبھلی بھی نہیں تھیں۔ دونوں ملکوں کی جو مشترک فوج تھی ابھی تو وہ بھی پوری طرح تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ ایک غیر جانبدار یا نیوٹرل فورس ابھی تک باقی تھی جس کی کمان ایک انگریز جرنیل کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ دونوں مملکتوں کا ایک مشترک سپریم کمانڈر تھا جس کا حکم ابھی اثر رکھتا تھا۔

ابھی دونوں طرف سے لاکھوں شہریوں کی ہجرت کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر روز ناگوار واقعات ہو رہے تھے۔ ابھی دونوں طرف سے الزامات عائد کیے جا رہے تھے کہ فوج اور حکومت خود مہاجرین کا قتلِ عام کرا رہی ہے۔ ان حالات میں اگر پاکستان کی طرف سے دو بکتر بند گاڑیاں قبائلیوں کی مدد کے لیے سری نگر تک چلی گئیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہندوستان والے ہم پر ایک اور الزام عائد کر دیں گے۔ کچھ اور شور شرابا کریں گے ——— میں یہی کچھ سوچتا ہوا انتہائی رفتار سے راولپنڈی جا رہا تھا اور مطمئن تھا کہ مجھے دو بکتر بند گاڑیاں مل جائیں گی ——— میں تو یہی کچھ سوچ رہا تھا مگر کشمیر کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ میری سوچیں محض بے معنی اور بے اثر تھیں۔

میں امیدوں سے دل کو خوش کرتا راولپنڈی پہنچا۔ فوراً کرنل مسعود سے ملا۔ انہوں نے پیش کش کی کہ وہ بکتر بند گاڑیوں کی بجائے وہ مجھے بکتر بند گاڑیوں کی پوری رجمنٹ دے دیں گے۔ انہوں نے یہاں تک خطرہ مول لیا کہ کہنے لگے کہ رجمنٹ کے افسر اور جوان وردی کی بجائے عام کپڑوں میں جائیں گے اور سرکاری اجازت کے بغیر جائیں گے اور یہ بھی کہ وہ اپنی ذمہ داری پر جائیں گے۔

یہی تو اس صورتِ حال کی ضرورت تھی جو ایسی ذرا فضل سے پوری کی جا رہی تھی۔ بکتر بند رجمنٹ کشمیر کے لیے تیار ہونے لگی۔ میں اس دوران بریگیڈیئر شیر خان، لیفٹیننٹ کرنل ارباب اور مرکزی وزیر راجہ غضنفر علی خان سے ملا۔ ان سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ بریگیڈیئر شیر خان اور راجہ غضنفر علی نے بکتر بند گاڑیاں لے جانے کی مخالفت بڑی شدت سے کی۔ انہوں نے وہی دلائل پیش کیے جو پہلے ہی میرے ذہن میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی اور حکومت میں کھچ نہیں بخشے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بکتر بند گاڑیاں چلی بھی گئیں تو کامیابی کی توقع بہت کم ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ میں کمانڈ کا کمانڈر نہیں ہوں۔ چنانچہ بکتر بند گاڑیوں کی تجویز مسترد کر دی گئی۔

بکتر بند گاڑیاں تباہیوں کی مدد کو نہ جا سکیں اور قبائلی سری نگر میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ڈھونڈ سکے۔ وہ ٹھوس اور موثر مدد کے بغیر سری نگر میں داخل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

چھٹا باب

قبائلی سرینگر سے غائب ہو گئے

چار روز تک راولپنڈی کی فضا میں امیدیں اور توقعات چھائی رہیں۔ ہر طرف قبائلیوں کی جنگی کامیابیوں کے چرچے تھے۔ لمحہ لمحہ پر چرچے سنسنی خیز ہوتے چلے جا رہے تھے اور افسانے سننے میں آتے تھے۔ ہر کسی کو امید تھی کہ سرینگر پر قبضہ یقینی ہو گا۔ چنانچہ ہر کوئی بیتابی سے اس خبر کا منتظر تھا۔

ایک صبح یہ خبر آئی کہ ہندوستانی فوجیں سرینگر سے نکل کر پیش قدمی کر رہی ہیں اور قبائلی مقابلہ کیے بغیر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ یہ خبر صوبہ سرحد کے وزیر اعظم خان عبدالقیوم خان نے دی تھی۔ خورشید انور کے ساتھ اس کا رابطہ تھا۔ قیوم خان بھاگے بھاگے ایبٹ آباد پہنچے۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی ان سے جا ملے۔ وہ قبائلیوں کے لیڈروں سے ملنا چاہتے تھے۔ شام کے وقت مجھے ایبٹ آباد سے ٹیلیفون آیا کہ قیوم خان اور دوسرے لیڈر نصف شب کے قریب راولپنڈی پہنچ رہے ہیں اور وہ مجھے میرے گھر پر ملیں گے۔

رات کو خان عبدالقیوم خان، نواب ممدوٹ اور فرنٹیئر ریجن کے سیکرٹری کرنل اے ایس بی شاہ میرے ہاں آئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ قبائلی سرینگر سے چند میل پیچھے ہٹ آئے ہیں اور انہیں محاذ پر واپس بھیجنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں ——— ان لیڈروں نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں کشمیر کی جنگ کی ذمہ داری سنبھالنے کو تیار ہوں؟

میں نے جواب دیا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان سے بات کر لیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ پہلے ہی لیاقت علی خان صاحب سے بات کر چکے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ حکومت پاکستان

کشمیر میں مداخلت نہیں کرے گی نہ ہی سرکاری افسروں کو کسی بھی شکل میں مداخلت کی اجازت دی جائے گی ـــــ اور لیاقت علی خان نے یہ بھی کہا تھا کہ کشمیر کی جنگ ہر قیمت پر جاری رہنی چاہیے۔

اب میرے کرنے کا کون سا کام باقی رہ گیا تھا جو اگر میں کوئی ذمہ داری سنبھال بھی لیتا تو میں محض ایک سٹاف آفیسر تھا جنگ میں ساتھ لے جانے کے لیے میرے پاس کوئی فوج نہیں تھی نہ میرے پاس توپیں تھیں جو میں وقت ضائع کیے بغیر میدان جنگ میں بھیج دیتا۔ لیڈر راولپنڈی، ایبٹ آباد، نوشہرہ اور پشاور میں پاکستان آرمی کے سینئر کمانڈروں سے مل چکے تھے۔ کوئی بھی ان کی مدد نہ کر سکا تھا۔ اس کے باوجود اس سنگین مسئلے کو یہیں پر ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا، اس کی پیش کش کر دی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں کشمیر کے محاذ پر چلا جاؤں گا اور جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکا کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کشمیر جانے کے لیے مجھے ٹینکس دیں گے اور دشمن سے چھینا ہوا ایک وائرلیس سیٹ بھی دیں گے کیپٹن تسکین الدین میرے ساتھ سٹاف آفیسر کی حیثیت سے جانے کو تیار ہو گئے۔ میں نے دو سگنلرز ساتھ لے لیے جو وائرلیس سیٹ کے استعمال کے لیے رضاکارانہ طور پر جانے کو تیار ہو گئے تھے۔ ہم اگلی صبح روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔

قبائلیوں کی پسپائی ایسی نہیں تھی کہ وہ بتدریج منظم طریقے سے پیچھے ہٹے ہوں بلکہ وہ محاذ سے منہ موڑ کر بالکل ہی غائب ہو گئے تھے۔ ایسی شاندار پیش قدمی کا یہ انجام بڑا ہی پریشان کن تھا۔ ذرا کشمیری مسلمانوں کی کیفیت کا اندازہ کیجیے۔ وہ کئی نسلوں سے ایک اجنبی اور غیر ملکی مہاراجہ کے ظلم و استبداد میں پس رہے تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی انہیں ایسے مہاراجہ سے نجات ملے گی۔ آخر ایک روز اچانک مہاراجہ کی حکمرانی کو زوال آ گیا۔ مگر اب پھر اچانک انہیں مہاراجہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

مہاراجہ جو اپنے قانونی حقوق اور اپنی قوت کی پناہ میں چھپا بیٹھا تھا، تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی سرحدوں میں یہ بھونچال آئے گا۔ مگر ضرب کلیم ایسی زور سے پڑی کہ وہ جو تھے بھی ان اپنے دار الحکومت سے بھاگ گیا۔ مگر ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ جب اس نے تصور کر لیا تھا کہ وہ اپنا راج اور سب کچھ کھو بیٹھا ہے، ایک بار پھر وادی کا آقا تھا۔

قبائلی پٹھان —— کچھ روایات، کچھ حقائق

پاکستان اور ہندوستان کے تجربہ کار سپاہی جو قبائلی پٹھانوں کی جنگی اہلیت اور خصائل سے واقف تھے، ابتدا میں اس سے زیادہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ کشمیر میں جا کر قبائلی کہیں کہیں گھات لگانے اور لوٹ مار کرنے کے سوا کچھ اور بھی کر سکیں گے لیکن قبائلی برق رفتار پیش قدمی کرتے ہوئے اور مہاراجہ کی فوج کو اپنے آگے بھگاتے ہوئے کشمیر میں ایک سو میل تک اندر پہنچ گئے تو قبائلیوں کے متعلق ماہرانہ رائے دینے والے حیرت زدہ ہو گئے۔ وہ ابھی اس حیرت سے ہم آہنگ ہو رہے تھے کہ یہ خبر ملی کہ قبائلی محاذ سے بھاگ آئے ہیں اور میدان جنگ سے بالکل ہی غائب ہو گئے ہیں —— معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانیوں نے یا تو دیکھا ہی نہیں کہ قبائلی میدان جنگ سے نکل گئے ہیں یا انہوں نے اسے دھوکا یا چال سمجھا تھا کیونکہ ہندوستانی فوجیں قبائلیوں کے خالی کیے ہوئے علاقے پر قبضہ کر لینے کے لیے آگے نہ بڑھیں۔

ہندوستانیوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ۸ نومبر کے روز انہوں نے سرینگر کے باہر قبائلیوں سے بارہ گھنٹے جنگ لڑی ہے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ قبائلی وہاں سے دو روز پہلے ہی کھسک گئے تھے چند ایک ساتھیوں کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے جو اکا دکا گولی چلاتے رہے تھے۔ ہندوستانیوں نے یہ بھی بڑی بات کی تھی کہ قبائلی اپنی پانچ سو لاشیں پیچھے چھوڑ گئے تھے —— جو لوگ شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں وہ ہندوستانیوں کے اس دعوے کو کہ قبائلی پانچ سو لاشیں چھوڑ گئے تھے محض بے بنیاد سمجھتے ہیں۔ شمالی افریقہ کے صحرا کے درویشوں کے متعلق یہ دعویٰ مانا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ہجوم کی صورت میں لڑا کرتے تھے یا پرانے زمانے کے راجپوت میدان جنگ سے بھاگنے کی بجائے مرجانا پسند کرتے تھے۔

قبائلیوں کے متعلق یہ صحیح ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اتنی تعداد میں مرے ہوں کیونکہ وہ ہجوم کی صورت میں نہیں بلکہ دو دو، ایک ایک ہو کر گوریلا جنگ لڑا کرتے ہیں۔ جہاں تک لاشوں کا تعلق ہے پٹھان لاش پڑی رہنے ہی نہیں دیتے تھے۔ وہ ہر ایک لاش چار سو میل پیچھے اپنے گھروں تک لے جاتے تھے۔ حقیقت یہ بھی کہ سرینگر کے مضافات میں کوئی قابل ذکر معرکہ نہیں ہوا تھا کوئی قابل ذکر تصادم اور جھڑپیں وغیرہ ہوئی تھیں۔ یہی وجہ سب کو پریشان کر رہی تھی کہ آخر ہوا کیا!

میں واضح کرتا ہوں کہ کیا ہوا تھا —— قبائلیوں کی پسپائی کو سمجھنے کے لیے قبائلیوں کو سمجھ

ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے طریقۂ جنگ اور میدان جنگ کے حالات کو بھی سمجھ لیا جائے۔ تشکیل پاکستان سے پہلے کے اندازے کے مطابق صحیح قبائلیوں کی تعداد دو لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ یہ تعداد دہشت ناک تھی۔ تعداد کے علاوہ ان کی اہمیت اور ہیبت اس علاقے کی نوعیت کی وجہ سے تھی جہاں ان کا راج تھا اور جو ان کا پناہ وطن ہے۔ وہ جنگی اہمیت کی ایسی سرزمین پر رہتے ہیں جس کے متعلق سر اولف کیرو نے اپنی کتاب ـــ دی پٹھان میں لکھا تھا ـــ "اس خطے نے تاریخ میں اتنے زیادہ حملے دیکھے اور برداشت کیے ہیں جو ایشیا کے کسی اور ملک بلکہ دنیا کے کسی اور ملک نے نہیں دیکھے...... یہاں سورج اور ہوا میں ایسی تاثیر ہے جو یہاں کے انسانوں کو اٹھنے اور ابھرنے پر اکساتی ہے۔ یہاں کی دشوار گزار، اونچی نیچی چٹانوں کے اوقات ہی مسلسل رہتے کہ وہ دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہیں۔"

بعض قبائل اس قدر قدیم ہیں کہ تاریخ بھی نہیں جانتی کہ وہ کب سے یہاں آباد ہیں۔ وہ غالباً ۱۰،۰۰۰ قبل مسیح سے یہاں ہیں۔ تیمور و غزنی میں قبائلیوں کو سب سے زیادہ بہادر قوم کہا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ ان مسلمان فوجوں کے ہراول میں جانے لگے جو ہندوستان پر حملے اور قبضے کے لیے آتے تھے۔ پہلے پہل قبائل مالِ غنیمت کے خیال سے حملے میں شریک ہوتے تھے۔ پھر وہ ریڈ فسٹریز اور بادشاہ بن کر آنے لگے۔ اس دوران ان کا اپنا خطہ کسی بھی بیرونی حملہ آور کی عملداری میں نہ آسکا۔ خود پٹھان بادشاہ بھی اس خطے پر حکمرانی نہ کر سکے، حالانکہ یہ حملہ آور انہی پہاڑیوں کے دروں سے آتے تھے جو ان قبائلیوں کا وطن ہے۔ ان گنت حملہ آور آئے جن میں سکندر اعظم، چنگیز خان اور تیمور لنگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے باوجود تمام پٹھان قبائل آپس میں منقسم رہے مگر ہر طور اپنے وطن کی آزادی کے لیے انفرادی طور پر لڑنے کے لیے تیار رہے۔

یہ ہیں وہ انسان جن کا شمار دنیا بھر کے بہترین لڑاکا اور جنگجو لوگوں میں ہوتا ہے۔ ان کے بر عکس مخالفین نے ان کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ جابر قسم کے منصب میں کیونکہ وہ لوٹ میں اپنے دشمن کی کوئی عملی مسافت نہیں کر سکے۔ انہی قبائل میں سے کچھ پٹھان کشمیر گئے تھے ــــ پھر ایسا کیوں ہوا کہ اس قسم کے جنگجو کشمیر میں ناکام ہوئے؟

ان کی ناکامی کی وجوہات تو منظر عام سے ہی سامنے آنے لگی تھیں۔ یہ لوگ جب جنگ میں جاتے ہیں تو بڑی لمبی لمبی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ جنگ کے دوران ہر ایک گھنٹے شگون

سکتی ہے۔ اطلاعات دے سکتی ہے اور کمک وغیرہ کی بدولت جنگ کو طول دے سکتی ہے۔
اس کے پاس توپ خانہ بھی ہوتا ہے۔ مارٹر گنیں، مشین گنیں اور طیارے بھی ہوتے ہیں۔

قبائلی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ دشمن کو ایسی پوزیشن میں لائیں جہاں وہ اپنے طور طریقے سے لڑ سکیں۔ چونکہ ان کی کوئی مرکزی کمان نہیں ہوتی، ہر قبائلی اپنے طور پر لڑتا ہے اس لیے وہ جب چاہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے غائب ہو جاتا ہے۔ وہ کسی منظم فوج کا تو سپاہی ہوتا نہیں۔ فوج کے دستے تو اس طرح نہیں کر سکتے۔ لہٰذا قبائلی کی برتری اس کی آزادی اور آزادانہ نقل و حرکت میں ہے۔ اس برتری کی بدولت بعض اوقات وہ غیر متوقع جگہ پر پہنچ کر اپنا کام کر جاتا ہے۔ اسی وصف کی وجہ سے وہ فوجوں کے لیے مستقل پریشانی کا باعث بنا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ اس کے دو ہی ہتھیار ہوتے ہیں۔ ایک رائفل اور ایک چاقو۔ جسمانی لحاظ سے قبائلی خاصا توانا ہوتا ہے۔ بڑا طویل سفر وہ پیادہ طے کر سکتا ہے اور فوجوں کی نسبت تیزی سے گھوم پھر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ گھومتا پھرتا رہتا ہے اور صبر و تحمل سے شکار کو دیکھتا رہتا ہے۔ جوں ہی اسے موزوں شکار ملتا ہے وہ اس پر بجلی کی تیزی سے ٹوٹ پڑتا ہے۔ محسود قبیلے کے ایک پٹھان نے اپنی اس جنگی چال کو مجھ پر اس طرح واضح کیا تھا کہ پٹھان عقاب کی طرح آوارہ پھر آسمان میں منڈلاتا رہتا ہے اور جوں ہی اسے شکار نظر آتا ہے وہ بلندی سے اس پر جھپٹ پڑتا ہے۔ شکار کو دبوچ کر وہ انتظار نہیں کرتا بلکہ جھپٹتے ہی کسی دور دراز جگہ کو اڑ جاتا ہے اور شکار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ قبائلی کا انداز عقاب سے ملتا جلتا ہے۔ حرکت کی تیزی، حملے کی طاقت کے تعین اور شکار کے انتخاب میں آزادی اور شکار مارنے کے بعد جائے واردات سے غائب ہونے میں سہولت اور تیزی یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے معرکوں سے گریز کرتا ہے جو اسے زیادہ دیر تک ایک ہی پوزیشن میں باندھے رکھیں۔ سرینگر کے محاذ کا اقدام یہی تھا کہ قبائلی ہم کو لڑنے والے ایک منظم فوج کی طرح دشمن کے مقابل ہو بیٹھے تھے۔ انہیں یہ جنگ ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنی تھی۔ انہیں اپنے آپ کو دشمن کے توپ خانے اور طیاروں سے بھی بچانا تھا۔ ایسی صورت میں لازم تھا کہ علاقوں کے اپنے ملک کی طرح پہاڑی ہو کہ جہاں وہ چھپ کر لڑ بھی سکتے اور اپنے آپ کو توپوں اور طیاروں سے بھی بچا سکتے۔

پٹھان سری نگر میں کیوں ناکام رہے؟

پہاڑی علاقوں کے لیے اس لیے بھی موزوں ہوتا ہے کہ وہاں دشمن موٹر ٹرانسپورٹ استعمال نہیں کر سکتا۔ لہٰذا فوجوں کو پیدل نقل و حرکت کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے دشمن کی نقل و حرکت میں خاصا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی قبائلی سری نگر کے باہر نہیں لڑ سکتے تھے کیونکہ بارہ مولہ سے سری نگر تک سڑک کے دونوں طرف علاقہ میدانی ہے جو قبائلیوں کے طریقہ جنگ کے لیے بڑا ہی نقصان دہ تھا۔ اگر قبائلیوں کو وہاں رہنا ہی تھا تو ضروری تھا کہ سری نگر کی دوسری طرف قبائلیوں کا ایک اور لشکر بھیجا جاتا یا وہ کشمیر کے رضا کار دوسری طرف سے سری نگر پر حملہ کرتے۔ ۲۰ اکتوبر کے روز ایسی تجویز پیش کی بھی گئی تھی مگر اسے محض اس لیے نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ متعلقہ افراد ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی میں مبتلا تھے۔ گو ۲۰ اکتوبر بھی موزوں دن نہیں تھا کیونکہ تاخیر ہو چکی تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ کوشش ہونی چاہیے تھی۔ کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہو ہی جاتا۔ ہندوستانیوں کو کم از کم سری نگر کے دو فرد بھیجنا پڑتا۔

۲۰ اکتوبر کو ہی ہماری طرف سے حملوں کو نظر انداز کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں ہندوستان تمام تر طاقت سری نگر پر مرکوز کر رہا تھا۔ دو روز بعد یعنی ۲۹ اکتوبر کے روز قبائلیوں کو سری نگر سے باہر چھ سنگ میل پر روک لیا گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ انہیں بجز بندوقچیوں کی یا ایسی ہی کوئی موثر مدد دی جاتی۔ انہیں کوئی مدد دی گئی بلکہ انہیں ایسی زمین پر اور ایسے حالات میں تنہا چھوڑ دیا گیا جہاں لڑنا ان کے بس سے باہر تھا۔

ہر گھڑی سری نگر میں اترنے والی ہندوستانی فوجوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود قبائلی چار پانچ دن جائزہ لیتے رہے کہ شاید کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے مگر انہیں احساس ہو گیا کہ صورت حال ان کے خلاف ہے اور اگر ہندوستانی فوج نے حملہ کر دیا تو پیچھے کوئی ایسا موزوں علاقہ نہیں ہے جہاں قبائلی پیچھے ہٹ کر دفاعی پوزیشن اختیار کریں۔ علاقہ میدانی تھا جو قبائلی طریقہ جنگ کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اگر قبائلی وادی میں یعنی پہاڑی علاقے میں چلے جاتے تو وہ لڑ سکتے تھے لیکن وہاں لڑائی بے مقصد تھی۔ وہاں ہندوستان کی فوج انہیں گھیرے میں لے سکتی تھی۔ اصل مقصد تو سری نگر میں داخلہ تھا جو ممکن نہ رہا تھا تو قبائلیوں نے وادی میں لڑنے کو بے معنی سمجھا۔ قبائلی جب غائب ہونے کا فیصلہ کرتا ہے تو حیران کن

تیزی سے غائب ہوتا ہے جیسے ابھی یہاں تھا اور ابھی غائب ہو گیا۔

سرنگ سے بارہ سو واپس آ کر میدانِ جنگ سے نکل کر قبائلی کچھ دیر بارہ مولا میں رکے۔ اگر وہاں بھی انہیں کم سے کم مدد مل جاتی یا صورتِ حال کم سے کم ان کے موافق ہوتی تو وہ وہیں رکے رہتے۔ اس صورت میں ہندوستان کی فوج انہیں وہاں سے کبھی بھی نکال نہ سکتی کیونکہ وہ علاقے کے ہر پہلو سے ان کے واقف تھے۔

اپنے سرحدی علاقے میں قبائلی دشمن کی پیش قدمی کرتی ہوئی فوج کے ہراول یا پہلو پر اکا دکا گولی چلاتے تھے۔ وہ زیادہ دیر تک حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مار کر بھاگ جاتے تھے۔ وہ کسی بڑی فوج کا حملہ روک تو نہیں سکتے تھے، البتہ اپنے مخصوص طریقہ جنگ سے فوج کو خاصا نقصان پہنچا کر حملے میں تاخیر پیدا کر سکتے تھے۔ اگر ہراول کمزور ہو تو اسے مکمل طور پر روک بھی لیتے تھے اور کبھی کبھی بھگا بھی دیتے تھے۔ یہ کامیابی وہ ایک ایک فرد ہو کر اکا دکا گولی چلا کر یا دو دو چار چار کی ٹولیوں میں حملے کر کے فوج کو دن رات پریشان کرتے رہتے تھے حتیٰ کہ فوج تنگ آ کر پسپا ہونے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ یہ کامیابی وہ صرف اپنے ملک میں حاصل کر سکتے تھے جہاں انہیں چھپنے اور اپنی کارروائی کر کے غائب ہونے کے لیے موزوں جگہیں اور وادیاں میسر تھیں۔ اور وہاں ان کے اپنے لوگ ان کے زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے، کھانے اور رہائش کی سہولتیں دینے کے لیے موجود ہوتے تھے۔ وہاں وہ ہر طرح سے محفوظ تھے۔

کشمیر میں انہیں ایسی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ وہ ایک اجنبی ملک میں تھے جہاں کے عوام ابھی پوری طرح مسلح ہوئے نہیں تھے۔ نہ ہی ان کے پاس ایسے ذرائع تھے کہ قبائلیوں کی کوئی مدد کرتے اور نہ ہی وہ اپنے جنگی عادات اور قبائلیوں کی طرح لڑنے اور مشکلات برداشت کرنے کے عادی تھے۔ قبائلیوں کا دارومدار اسی واحد سڑک پر تھا جہاں سے کوئی بوجھ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ سڑک کی حفاظت بھی ان کے لیے ضروری تھی۔ ان کی اصل ضرورت سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک دفاعی اڈہ تھا جہاں سے وہ حملے کر سکتے اور جہاں حملہ کر کے وہ واپس آ سکتے۔ تاہم وہ ایسے اقدام کے لیے اپنے آپ کو ماہر نہیں سمجھتے تھے۔ سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کرنا اور خود مورچے بنا کر سوچ سمجھ کر جم جانا کسی اور کا کام تھا۔ یہ کام باقاعدہ فوجی ایک قابل لیڈر کے تحت ہی طرح کر سکتے تھے مگر وہاں نہ کوئی ایسا انتظام تھا نہ ایسے انتظام کے متعلق سوچا گیا تھا۔

پسپائی کے دوران قبائلیوں کو ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں وہ اپنی اڑیاں روک کر چھاپا دیتے اور ہندوستانی فوج کی پیش قدمی روک سکتے۔ اس کیلئے پہاڑی علاقہ ضروری تھا جو وہاں نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ لڑنے کے لیے موزوں جگہ نہیں ہے تو وادیوں میں بیٹھے انتظار کرتے رہنے سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا پیچھے چلے جانا بہتر ہے۔ وہ کشمیر سے نہیں بھاگنا چاہتے تھے لیکن وہ انتظار کسی اور جگہ کرنا چاہتے تھے۔

وہ محسوس کر رہے تھے کہ انہیں پاکستان نے بے یار و مددگار چھوڑ کر خراب کیا ہے جبکہ وہ اپنی مرضی سے کشمیر میں لڑنے آئے تھے مگر صرف ریاست کی فوج کے خلاف۔ اس فوج کے خلاف انہوں نے توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی مگر کسی نے ان کے ساتھ یہ طے نہیں کیا تھا کہ انہیں ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے خلاف بھی لڑنا پڑے گا جس کے پاس توپ خانہ ٹینک اور ہوائی جہاز سے بھی ہوں گے۔ اس کے باوجود وہ ہندوستان کی نو وارد فوج سے لڑے اور مزید کامیابی حاصل کی لیکن انہیں توقع تھی کہ صورت حال کی اس تبدیلی میں پاکستان آرمی ان کی مدد کو آئے گی۔ انہیں یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ ان کی مدد کے لیے پاکستان آرمی کا کوئی دستہ آیا نہ توپ خانہ نہ ٹینک نہ کوئی طیارہ۔ انہیں انتہائی معمولی نوعیت کی مدد بھی نہ دی گئی کہ انہیں عقب میں کوئی مستحکم بیس (اڈہ) ہی بنا دیا جاتا تو یہی وہ ان کی مدد تھی مگر کچھ بھی نہ کیا گیا۔

لہٰذا ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کی رات تک قبائلی لشکر کا بیشتر حصہ اوڑی تک پیچھے ہٹ گیا۔ اوڑی سرینگر سے پچاسی میل دور اور بارہ مولا سے تیس میل پیچھے ہے۔ اگلی صبح وہاں سے قبائلی ٹولیوں میں کشمیر سے ہی نکلنے لگے۔

۸ نومبر ۱۹۴۷ء کی شام یہی صورت حال تھی جب میں راولپنڈی سے مری کے لیے روانہ ہوا۔

ساتواں باب

مایوسی میں ایک اور کوشش

میں نے مظفر آباد سے تیس میل دور گاڑی روکی۔ میرے سامنے سڑک ایک رکاوٹ سے بند کی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے بلند آواز سے پوچھا — کون ہے؟ — مجھے تاریکی میں چناری کے ڈاک بنگلے کے آثار نظر آنے لگے۔ ہندوستانی طیاروں نے بمباری سے اس ڈاک بنگلے کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ وہاں مجھے پانچ چھ آدمیوں کے سائے سے باہر آتے نظر آئے۔ وہ سوات کی فوج کے آدمی تھے۔ قریب آئے تو دیکھا کہ وہ قبائلیوں سے بہت مختلف تھے۔ لباس اچھا اور گفتار میں نرمی تھی۔ ان کا نائب کمانڈر کیپٹن رشید تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان کی نفری تین سو ہے۔ وہ آزاد کشمیر کے مجاہدین کی مدد کرتے ہوئے ریاست کشمیر کی فوج سے پانچ پوسٹ چھین کر ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔

قریب ہی ایک کار کھڑی تھی۔ میں نے اس کار کو اندھیرے میں بھی پہچان لیا۔ یہ وہی کار تھی جو میں نے چند دن پہلے قبائلیوں کے قافلے میں دیکھی تھی۔ اس پر جھنڈا ابھی تھا چھت نہیں تھی۔ بتیاں نہیں تھیں اور اس کی بریکیں بھی نہیں تھیں۔ یہ سوات آرمی کی کار تھی۔

کیپٹن رشید کو ابھی پوری طرح علم نہیں تھا کہ سرینگر کے باہر کیا ہوا ہے۔ میں نے اسے تفصیل بتایا اور اسے کہا کہ وہ میرے ساتھ آگے چلے اور دیکھے کہ ایسے ... ایسی حالات میں وہ کیا مدد دے سکتا ہے۔ وہ تیار ہو گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر اس کا کمانڈر رضامند ہو گیا تو وہ اپنے دستے کو بھی ساتھ لے چلے گا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میرے پیغام کا انتظار کرے۔

میں گاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ یہ لوگ مدد کے لیے موجود ہیں۔ ان کے

متعلق کسی نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا۔ غالباً کسی کو پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ بھی کشمیر میں آئے ہوئے ہیں۔ کیپٹن رشید میں جوش و خروش تھا۔ میں نے سوچا اس علاقے کی جو صورت حال مجھے بتائی گئی تھی وہ اس سے مختلف ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔

میں نصف شب کے قریب اڑی پہنچا۔ وہ قبائلیوں کے کمانڈر تو تھے مگر میں انور کو ڈھونڈنے لگا۔ اس جگہ پر موت کا سکوت طاری تھا۔ اس سڑک پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کوئی پکارنے والا موجود تھا کہ کون ہے؟ قریب جا کر دیکھا کہ تمام مکان جلے ہوئے تھے یا بمباری سے تباہ شدہ تھے۔ کہیں کہیں وہاں لاریاں کھڑی تھیں۔ ان کے ڈرائیوروں سے پوچھا تو وہ کوئی کام کی بات نہ بتا سکے۔ انہوں نے یہ ضرور بتایا کہ قبائلی یہیں ہیں۔ خورشید انور کا کچھ پتہ نہیں۔ میں اور تو کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ بمباری کے ساتھ ساتھ مجبوریوں کی تو شیخ لینے لگا۔ میں ہر ایک تجویز پر سوچ رہا تھا۔

ایک جگہ مجھے میجر اسلم بریگیڈیئر کا علم ہوا۔ وہ بھی یہاں تھا اور بتایا گیا تھا مجھے پہلے سے اس کے متعلق علم نہیں تھا۔ میری طرح اس کی کان میں بھی کوئی فوج یا دستہ نہیں تھا لیکن اس کے پاس کچھ معلومات ضرور تھیں۔ اس روز یا ایک رات پہلے ایک ہندوستانی بریگیڈ بارہ مولہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی بریگیڈ اور قبائلیوں کے درمیان تیس میل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ تیس میل کا علاقہ ایسا تھا جو قبائلیوں کے لڑنے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ مکمل طور پر پہاڑی علاقہ تھا جس میں سے تنگ سی ایک سڑک گزرتی تھی۔ ہندوستانی بریگیڈ یہاں سے صرف اسی سڑک کو استعمال کر سکتا تھا۔ یہ دونوں طرف سے بند تھی۔ ایک طرف گہرا اور تیز دریا ہے جہلم تھا جسے عبور کرنے کے لیے اڑی اور بارہ مولہ کے نصف فاصلے پر ایک پل تھا جس سے پیدل گزرا جا سکتا تھا۔ سڑک کی دوسری طرف درختوں اور جھاڑیوں میں ڈھکی ہوئی بلند پہاڑیاں تھیں۔ سڑک سیدھی نہیں تھی بلکہ ہر تین چار سو گز پر موڑ تھے اور میل دو میل کے بعد چھوٹے بڑے پل تھے۔

بریگیڈ کو اس علاقے سے خیریت سے گزرنے کے لیے ہندوستانیوں کے لیے ضروری تھا کہ سڑک کو قبائلیوں کی فائرنگ اور حملوں سے محفوظ کر دیتے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ سڑک کو محفوظ کرنے کے لیے پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پکٹوں کی ضرورت تھی مگر ان کے لیے بیکار تھیں کیونکہ یہ پہاڑیاں شمال مغربی سرحدی صوبے کی پہاڑیوں کی طرح ننگی نہیں تھیں۔ ان پر درخت تھے۔ اس کے علاوہ سڑک سیدھی بھی نہیں تھی۔ حفاظت کی یہی ایک صورت تھی کہ ہندوستانی ہر ایک چوٹی پر

ایک ایک دستہ مورچہ بند کر دیتے جو کسی صورت ممکن نہ تھا۔ قبائیلیوں کی موجودگی میں چوکیوں پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے بے تحاشہ فوج کی ضرورت تھی۔ جہاں تک ہندوستانیوں کے ایک بریگیڈ کا تعلق تھا، وہ یا تین سو محسود اسے وہیں روک سکتے تھے جہاں وہ اس وقت تھا۔ وہ کئی ہفتوں تک اسے ہلنے نہ دیتے۔

پُل اڑانے کی مہم

یہ سڑک جن چھوٹے بڑے پلوں سے گزرتی تھی ان میں ایک بھی نہ اڑایا نہیں گیا تھا تاکہ ہندوستانی فوج رک جاتی۔ دو سڑک کے کسی حصے میں کوئی آدمی تھا جو اکا دکا گولی چلا کر بریگیڈ کی رفتار کم کیے رکھتا۔ ساتھ آئی این اے (انڈین نیشنل آرمی) کے رضاکاروں کا ایک گروپ پیچھے رہ گیا تھا جو دشمن سے چند میل دور تھا۔ وہ صرف مشاہدے اور دشمن کی پیش قدمی کے جائزے کے لیے پیچھے رہ گیا تھا۔

فوری طور پر ضرورت یہ تھی کہ ہندوستانی بریگیڈ کو آزادی سے دور روکنے کے لیے کوئی ایک پل تباہ کر دیا جائے۔ اس کے لیے سامان، بارود اور چند ایک آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اس سامان کی کوشش شروع کر دی گئی۔ میں نے سوات آرمی کے کیپٹن رشید کو پیغام بھیجا کہ اپنے آدمی لے آئے تاکہ صبح تک یہاں دفاعی مورچہ بندی کی جا سکے۔ میں نے سوچا کہ اس دوران قبائیلیوں کے لیڈروں سے بات کروں گا۔ سواتی جنگجو ہیں اور ان کے دل بڑے مضبوط ہیں لیکن انہیں بھی باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لہٰذا ان سے توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ محسود اور آفریدی قبائل کی طرح کامیابی سے لڑ سکیں گے۔ تاہم مجھے امید تھی کہ دفاعی پوزیشن میں وہ اچھا لڑیں گے۔

تھوڑی دیر بعد ہم آگے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہمیں پل اڑانے کا کوئی سامان نہ مل سکا۔ بارود [illegible] بھی نہ ملا۔ البتہ پٹرول کے بھرے ہوئے کچھ کنستر مل گئے اور کچھ گینتیاں۔ [illegible] رضاکار بھی ساتھ ہو گئے۔ ان میں ایک بوڑھا میجر بھی تھا جو کسی زمانے میں انگریزی فوج میں نائک ہوا کرتا تھا۔ اس نے پہلی جنگ عظیم کے زمانے کی برجس پہن رکھی تھی۔

ہم ایک لاری میں سوار ہوئے اور بارہ مولا کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہماری تقریباً حرکت پر دور آگے دیکھ رہی تھیں کہ کہیں دشمن سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ تھوڑی ہی دور جا کر ہمیں اطمینان ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ سامنے ایک فوجی گاڑی آ رہی تھی۔ ہم نے اسے روکا یہ چند سپاہی فوج کی گاڑی تھی اور اسے ہمارا ایک مسعود قبائلی چلا رہا تھا۔ وہ کہیں اکیلا ہی پیچھے رہ گیا تھا۔ اسے یہ گاڑی آتی نظر آئی تو اس نے گھات لگائی۔ گاڑی قریب آئی تو چیتے کی طرح جھپٹا اور ڈرائیور کو خنجر سے ہلاک کر کے گاڑی لے آیا۔ اس کی اصل جرأت تو یہ تھی کہ وہ دشمن کے درمیان سے یہ گاڑی گزار لایا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ دشمن ابھی پیش قدمی نہیں کر رہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پل اڑانے کے لیے ہمارے پاس کافی وقت ہے۔

ابھی رات کے آخری پہر کی تاریکی تھی۔ بارہ مولا سے کچھ فاصلے پر ہم نے ایک پل کو برباد کرنے کا فیصلہ کیا۔ رضاکاروں نے فوراً کام شروع کر دیا۔ صبح طلوع ہوتے تک انہوں نے پل میں اتنا بڑا شگاف ڈال دیا جس سے کوئی گاڑی نہیں گزر سکتی تھی مگر پل کے نیچے جو نالہ تھا وہ اتنا گہرا نہیں تھا۔ اس کے کنارے کوئی ایسے [illegible] تھے کہ نالے میں سے گاڑی نہ گزاری جا سکے۔ اس کا علاج یہ کیا کہ کچھ آدمیوں کو پل کے قریب پوزیشن میں کر دیا کہ دشمن اترتے اور نالے میں سے گزرے تو اس پر فائر کریں۔ مجھے امید تھی کہ اس طرح کی فائرنگ سے دشمن کی پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا ہو گی اور مجھے کچھ اور کارروائی کرنے کا وقت مل جائے گا۔ چند گھنٹے ہی نہیں مجھے پورا ایک دن مل سکتا تھا۔ بشرطیکہ یہ آدمی ثابت قدم رہیں۔ مجھے خطرہ یہ تھا کہ وادی کی فضا میں پسپائی کا تاثر غالب تھا جس سے متاثر ہو کر یہ چند آدمی پوزیشن سے ہٹ بھی سکتے تھے۔ یہ ڈر تو ہر کسی کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ لوگ بھاگ رہے ہیں۔ لہٰذا وہ اکیلے رہ جائیں گے۔

واپسی پر میں نے ایک نہایت موزوں دفاعی پوزیشن منتخب کی جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ سواتی اسے پسند کریں گے۔ مجھے توقع تھی کہ اس پوزیشن سے وہ چند دستانیوں کو کئی دنوں تک روکے رکھیں گے۔ تیسیوں کے پاس ابھی [illegible] سلامت تھے۔ سواتیوں کو بذریعہ ٹیلیفون پیغام دیا جا چکا تھا۔ فاصلہ صرف چالیس میل تھا۔ کسی بھی لمحے رشید کے پہنچنے کی امید تھی مگر یہ محض امید تھی —— ایک خواب، ایک خیال —— رشید [illegible] کی جگہ پر [illegible] سوات لاری کا کانوائے سوات چلا گیا تھا۔ ابھی واپس نہیں آیا۔ بہرحال ایک آدمی [illegible] بھیج دیا گیا تھا —— سوات وہاں سے تین سو میل دور تھا —— بات وہیں کی [illegible]

جب میں نے قبائلیوں کا سامنا کیا

میں آوڑی واپس آگیا۔ مجھے قبائلیوں اور ان کے لیڈروں سے ملنا تھا۔ فرنٹیئر ریجن کے سیکرٹری کرنل اے ایس بی شاہ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے قبائلیوں سے متعارف کرائے گا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ کرنل شاہ ہو یا نہیں مجھے قبائلیوں کا سامنا کرنا ہے۔ میں چونکہ خود پٹھان ہوں۔ اس لیے پٹھانوں سے متعارف کرانے کسی وقت کا ڈر نہ تھا۔ میں ان کی خصلتوں اور لڑنے کے طور طریقوں سے بھی واقف تھا۔ خود پٹھان ہونے کے علاوہ دس سال پہلے میں برطانوی ہند کی فوج میں افسر تھا اور دو سال قبائلیوں کے خلاف لڑ چکا تھا مگر یہاں کشمیر میں قبائلی مجھے نہیں جانتے تھے اور وہ میرے لیے اجنبی تھے میں جوں ہی ان سے مخاطب ہوا انہوں نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"آپ کون ہیں؟"

میں نے انہیں بتایا۔

"کیا آپ کو پاکستان گورنمنٹ نے بھیجا ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا پاکستان کی فوج کا کوئی دستہ ہماری مدد کو آ رہا ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا آپ اسلحہ اور ایمونیشن لائے ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیا پاکستان کشمیر لینا چاہتا ہے یا نہیں؟"

"ہاں، لینا چاہتا ہے۔"

"پھر پاکستان ہندوستان کی طرح توپیں اور طیارے کیوں نہیں بھیجتا؟ اپنی فوج کیوں نہیں بھیجتا؟ کیا فوج تنخواہ نہیں لے رہی؟"

میں نے قانونی پوزیشن سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ قبائلیوں کا یہ استفسار بے معنی نہیں تھا کہ اگر پاکستان کچھ بھی نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا تو پھر مجھے کشمیر میں کیوں

بھیجا ہے؟ صرف صلاح مشورے دینے کے لیے؟

میں نے انہیں بتایا کہ مجھے صلاح مشورے دینے کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ میں انہی کی طرح ایک رضاکار ہوں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کے لیے اور پاکستانیوں کے لیے کشمیر کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ پھر میں نے انہیں احساس دلایا کہ ہم پٹھان کیا ہیں، کیا کر سکتے ہیں ہمارے فرائض کیا ہیں اور قوم ہم سے کیا توقع رکھتی ہے۔ میں نے ایسی تقریریں جس سے خود مجھ پر ہیجان طاری ہو گیا مگر میں نے دیکھا کہ قبائلیوں پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہو رہا تھا گو بعض کے سر میری تائید میں ہل رہے تھے۔ وہ ایسی تقریریں پہلے بھی سن چکے تھے مگر اب یہ تقریر بے محل اور بے وقت لگ رہی تھی۔

میں انہیں صرف اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ جنگ سے دستبردار ہو گئے ہیں وہ لڑیں اور کسی کے وعدوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ مجھے ہر حال میں اپنے ساتھ سمجھیں۔ وہ محسوس تو کرنے لگے تھے کہ میں ان کے ساتھ ہوں لیکن ان کے لیے یہ کافی نہیں تھا۔ میں پاکستان کی حکومت کا نمائندہ نہیں تھا۔ میں تو نہ ہی کسی سیاسی پارٹی اور کسی قبیلے کا بھی نمائندہ نہیں تھا۔ میرے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ ایمونیشن اور جنگی ساز و سامان نہیں تھا اور میرے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ تاہم بات ابھی ختم نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک تجربہ کار سپاہی کی حیثیت سے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان پہاڑیوں میں آ کر پہلے سے کوئی تو بھی اگر وہ دشمن کو روک سکتے قبائلیوں کی بہت تھوڑی سی نفری صرف ہاتھوں سے ہندوستان کی فوج کو روک سکتی ہے۔

میں نے قبائلیوں کو یہ بتایا تو ان کے دل جو پسپائی سے بیدار ہونے لگے۔ وہ جنگ کے طور طریق کے متعلق باتیں کرنے لگے اور یہ بھی محسوس کرنے لگے کہ میں کچھ جانتا ہوں اور جنگ کے متعلق صرف کچھ کہنے کی اہمیت رکھتا ہوں۔

اوڑی میں دو قبائلی تھے۔ ان میں زیادہ وزیرستان کے محسود اور تیراہ کے آفریدی تھے جو بہترین لڑاکا قبائل تسلیم کیے جاتے ہیں مگر اب وہ لڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ان میں باقی جو تھے وہ پشاور اور مردان کے اضلاع کے عام پٹھان تھے — میں یہ دیکھ کر قدرے حیران ہوا کہ ان میں میرا بھائی بھی تھا — ان لوگوں کے پاس شکاری بندوقیں، پستول اور اسی قسم کے ہتھیار تھے جو میدان جنگ کے لیے بیکار ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ لڑنے پر آمادہ تھے اس لیے میں نے انہیں پل کی حفاظت پر مامور کر دیا اور بعض کو پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جانے کو کہا جہاں سے وہ ہندوستانی

طیاروں پر فائر کر سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ شکاری بندوقوں اور پستولوں سے طیاروں کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ البتہ دو فائدے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ ایک یہ کہ لڑنے کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا اور دوسرے یہ کہ ہندوستانی ہوابازوں کو یہ احساس دلایا جا سکتا تھا کہ نیچے سے ان پر فائر ہو رہا ہے جس سے انہیں گرایا جا سکتا ہے۔

میری اس تجویز کا خاصا اثر ہوا۔ جب ان لوگوں کو لڑنے کے لیے کام دیا گیا تو کئی گھنٹوں کی سستی، اکتاہٹ اور کاہلی جوش و خروش میں بدل گئی۔ کیمپ میں سرگرمی نظر آنے لگی۔ اچانک ہندوستان کا ایک طیارہ آ گیا۔ کئی قبائلیوں نے کیمپ میں سے ہی اس پر فائرنگ شروع کر دی بہت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور طیارے پر گولیاں چلانے لگے۔ صرف کیمپ ہی نہیں یوں لگا جیسے سارا کشمیر جاگ اٹھا ہو۔ طیارہ چلا گیا تو ہم پھر بحث و تمحیص میں مصروف ہو گئے۔ نصف گھنٹے بعد تین طیارے آئے اور کیمپ پر فائرنگ کرنے لگے۔ قبائلیوں نے رائفلوں سے ان کا مقابلہ کیا۔ خوب گولیاں چلائیں۔ طیاروں نے کچھ آدمی زخمی کر دیے اور تمام کیمپ کا برا حال کر دیا۔ وہ مکان بھی تباہ کر دیا جسے میں نے اپنا ہیڈکوارٹر بنانا چاہا تھا۔ تاہم قبائلیوں نے بے خوف و خطر طیاروں کا مقابلہ خوب کیا۔

ذرا سے اس تجربے نے میرا یہ مسئلہ حل کر دیا۔ فضا پھر سے جنگی ہو گئی۔ میں اب اس کوشش میں مصروف تھا کہ قبائلی کوئی آخری فیصلہ کریں۔ میجر خورشید انور جو ان کا کمانڈر بن کے ساتھ آیا تھا کشمیر سے جا چکا تھا۔ اب قبائلیوں کو کوئی نہ کوئی فیصلہ خود ہی کرنا تھا۔ دوپہر کے وقت ان کے لیڈروں نے کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ علیحدگی میں بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ایک محسود لیڈر خانے خان نے کہا کہ وہ اپنے تیس قبائلیوں کو ساتھ لے جا کر اس پارٹی کو مضبوط کرے گا جو ٹوٹے ہوئے پل کے قریب مورچہ بند ہے۔ یہ رضاکارانہ پیشکش تھی۔

ہم پھر بارہ مولا کی طرف روانہ ہو گئے۔ دن کے دو بجے ہمیں ذرا دور سے پل نظر آنے لگا۔ ہمیں ہندوستانی فوج کی ایک بکتر بند گاڑی بھی نظر آئی جو پل کے پار رکی ہوئی تھی۔ انفنٹری کے چند ایک جوان پل سے دور آ رہے تھے اور پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ ہمارا میجر ٹنگ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہیں تھا۔ خانے خان اپنے تیس آدمیوں کے ساتھ بروقت مدد کو پہنچ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے قبائلیوں کو اتنے قریب سے ایکشن میں دیکھا۔ انفنٹری

کا کوئی بھی فرد نہیں دیکھتا تو سرور حاصل کرتا۔ ہم فوج میں جو وصف پیدا کرنے کے لیے سالہا سال صرف کر دیتے ہیں، وہ وصف قبائلیوں کی فطرت میں شامل ہے۔ دشمن کو دیکھتے ہی موزوں زمین پر پہنچنے کے لیے برق رفتاری سے بکھر جانا اور چھپ کر ایکشن میں آجانا فوج کی درسی کتابوں کے عین مطابق تھا۔

حالانکہ فوراً ہی دشمن کا ایک طیارہ آ گیا جس نے ہر طرف اور ہر جگہ مشین گنوں سے فائرنگ شروع کر دی۔ کوئی بھی جگہ محفوظ نظر نہیں آتی تھی لیکن قبائلی پلک جھپکتے بکھر کر محفوظ کناروں میں چھپ گئے تھے۔ قریب ہی دریا پر پیدل گزرنے والوں کے لیے دریا پر چھوٹا سا ایک پل تھا۔ قبائلیوں کی نصف تعداد تیز دوڑتی پل سے پار چلی گئی۔ انہیں تیلیریوں کی آڑ میسر تھی۔ یہ نہایت موثر اور خوبصورت چال تھی۔ ہندوستانی اُس وقت تھے۔ قبائلی ان پر سیدھے سے حملہ کرنا چاہتے تھے اچانک انہوں نے بہتے ناگہانی کی طرح ہندوستانیوں پر تین اطراف سے حملہ کر دیا ——— سامنے سے اور دونوں پہلوؤں سے ——— ہندوستانیوں کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ وہ یقیناً یہی سمجھے ہوں گے کہ ہماری تعداد زیادہ ہے۔ وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اس حملے سے مجھے جس فائدے کی توقع تھی وہ یہ تھا کہ شام تک تو ہندوستانی اس طرح کھلے بندوں آگے نہیں بڑھیں گے۔ وہ پل سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ اگلی صبح وہ گشتی پارٹیاں بھیجیں گے اور اس کی رپورٹ کے بعد باقاعدہ فوج کی طرح حملے کا باقاعدہ پلان بنائیں گے۔ اس طرح ہمیں اپنی دفاعی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے مل جائیں گے۔

وہ چلے گئے ——— میں اکیلا رہ گیا

میں مطمئن ہو کر یہ دیکھنے کے لیے دوڑا چلا گیا کہ قبائیلوں کی کانفرنس کس فیصلے پر پہنچی ہے مگر وہ گومگو کے عالم میں تھے کبھی تو رضامند ہو جاتے تھے اور دوسرے ہی لمحے صاف انکار کر دیتے تھے۔ انہیں سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ان کا کوئی محفوظ اور مضبوط اڈہ نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ باقاعدہ فوج سڑک سے پرے کہیں مورچہ بند ہو جاتے تو وہ سارے کشمیر میں ہندوستانیوں کا شکار کھیلنے کے لیے آگے چلے جاتے۔ میں بدقسمتی سے ان کی یہ ضرورت پوری کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا چنانچہ بات چیت ناکام ہوتی چلی گئی۔

شام کے وقت ہندوستانی ابھی تک ٹوٹے ہوئے پل کے قریب موجود تھے یعنی پاکستان کی سرحد سے کچھ میل دور مگر جمعدار رحمت اور نائب خان اپنے تیس آدمیوں کے ساتھ اندھیرا ہوتے ہی پیچھے آگیا کیونکہ وہ وہاں اکیلے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس کا تیور یہ ہوا کہ دشمن کے سامنے کوئی بھی نہ رہا۔ اس وقت اوڑی میں ہر کسی کے ذہن میں یہی سوال گونج رہا تھا کہ کشمیر سے مکمل طور پر نکل جائیں گے۔ یہ اب ناگزیر تھا کیونکہ ہر کوئی بے چین تھا۔ سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے کے اندر بیشتر قبائلی اپنی لاریوں میں سوار ہو چکے تھے اور باقی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھے ابھی تک امید تھی کہ شاید ایک سو آدمی پیچھے رہ جائیں گے — میں تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔

ایک سو مختلف الانواع آدمی جن کے پاس صرف ایک ایک رائفل تھی اور جو غیر منظم تھے اور جن پر کسی قبیلے کی بھی کوئی پابندی نہیں تھی، ہندوستان کے بڑھتے ہوئے کالم کا جس کی نفری ایک ہزار تھی اور جسے بکتر بند گاڑیوں، توپ خانے اور طیاروں کی مدد حاصل تھی، کوئی مقابلہ نہیں تھا پھر بھی میری ایک ہی خواہش تھی کہ صرف ایک سو آدمی میرے ساتھ رہ جائیں۔ علاقے کے خدوخال ایسے تھے جن کی مدد سے دشمن کی پیش قدمی کی رفتار سست کی جا سکتی تھی۔ اس سے ہم اتنا وقت حاصل کر سکتے تھے جس کے دوران کمک پہنچ سکتی تھی — مگر یہ خواہش خواہش ہی رہی، پوری نہ ہو سکی۔ قبائلی پیچھے چلے گئے۔ بس ان کے ساتھ امیدیں بھی رخصت ہو گئیں۔ اوڑی تیزی سے ویران ہو گیا۔ پیچھے تباہ شدہ مکان اور جھونپڑے رہ گئے یا آوارہ کتے۔

اوڑی میں کم و بیش ایک ہزار آدمی تھے۔ بعض کے متعلق امید تھی کہ تعاون کریں گے بعض نے تعاون کے وعدے بھی کیے۔ بعض لاریوں میں سوار ہو گئے اور دشمن کی طرف روانہ ہو گئے مگر انہوں نے ارادہ بدل دیا اور پیچھے لوٹ آئے اور اب بھی جا رہے تھے۔ صرف دو ایک چند نے آخری وقت کچھ توجہ دی اور کچھ دلچسپی لی۔

کیا میرے بھی چلے جانے کا وقت نہیں آگیا؟ — میں نے سوچا — کیا میں ان کے چلے جانے کے بعد رکے رہنے کا ارادہ کروں؟ — اس سے کیا حاصل ہو گا؟ — مگر میری سوچیں بیکار تھیں۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ جانے والے اب انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گھروں کی سمت بھاگنے والوں میں اضافہ ہو رہا تھا، وہ جلدی میں تھے۔ انہیں جلدی کشمیر سے نکلنا تھا — وہ نکل گئے۔ چلے گئے۔

رات نو بجے آخری ہاری کی پچھلی سرخ بتیاں بھی اندھیرے میں دور جا کر گم ہو گئیں۔ میں وہاں کھڑا جائزہ لینے لگا کہ پیچھے کیا رہ گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ میرا ساتھی افسر کیپٹن تحسین الدین بھی اوور ازسیس سیٹ بھی چلا گیا ہے۔ کوئی دس بارہ آدمی رہ گئے تھے۔ باقی سب جا چکے تھے رضاکار، قبائلی، دیگر پٹھان۔ سبھی چلے گئے —— وہ ان کے ساتھ ہی سوات آرمی کا کیپٹن شیر بھی اپنے تین سو آدمیوں سمیت چلا گیا۔ میرا مشن مکمل ناکامی میں ختم ہو گیا۔ جو میں گھنٹوں کی کوشش خاک میں مل گئیں۔

لیکن مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ میں بھی چلا جاؤں۔ میں نے کشمیر کی جنگ کے لیے اپنا نام جنرل طارق رکھا تھا اور وہاں مجھے اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ میں اپنے آپ کو طارق جیسے عظیم جرنیل کا ہم پلہ نہیں سمجھتا تھا۔ یہ نام اپنی اصل حیثیت کو چھپانے کے لیے رکھا تھا۔

اس رات وادی میں میری حالت طارق بن زیاد والی تھی۔ بارہ صدیاں گزریں، اسپین کے ساحل پر اتر کر طارق نے کشتیاں جلوا دی تھیں۔ اسے کہا گیا تھا کہ یہ اقدام دانشمندانہ نہیں۔ ہم پیچھے کس طرح جائیں گے —— طارق نے کہا تھا "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" —— ہر ملک ہمارا ملک ہے کیونکہ یہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے۔

میں بھی پیچھے نہیں جا سکتا تھا —— کیا میں بھی کشتیاں جلا بیٹھا تھا؟

آٹھواں باب

اوڑی ___

دشمن ڈرتا رہا، ہم اسے دھوکہ دیتے رہے

رات آدھی گزر گئی تھی۔ آخری قبائلی کو رخصت ہوئے تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ اوڑی کے اردگرد کھڑے پہاڑ کچھ ایسا تاثر پیدا کر رہے تھے جیسے ہم بہت بڑے پیالے کے پیندے پر بیٹھے ہوئے ہوں ___ رات تاریک تھی، سرد تھی اور ہم چند ایک آدمی اس پیکر تاریکی میں تنہا تھے۔ میرے ساتھ میجر اسلم، دو ریٹائرڈ سابق فوجی، آئی این اے کا ایک سابق صوبیدار لطیف افغانی نام کا ایک سیاسی کارکن، دو ڈرائیور، ایک باورچی، میرا چھوٹا بھائی اور دو تین سویلین تھے ہمارے پاس کوئی ایک درجن رائفلیں تھیں اور ایک مشین گن (برین) جو دشمن سے چھینی گئی تھی۔ یہ ان تمام فورسوں میں سب سے چھوٹی اور سب سے زیادہ ناکافی فورس تھی جو میں نے کمانڈ کی تھیں۔ میرا سامنا ایک ایسے دشمن سے تھا جس کے لیے ایک ہزار کی جو نفری درکار تھی وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر رخصت ہو چکی تھی۔

میں نے سوچا کہ اس وقت قبائلیوں کا لشکر سرحد پار کر کے کشمیر سے نکل چکا ہو گا۔ ابھی چونکہ اس خطے کے کشمیری مسلمان منظم نہیں ہوئے تھے، اس لیے پچیس میل لمبی سڑک پر دشمن کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ میں یہ خطرہ محسوس کرنے لگا کہ اگر ہندوستانیوں کو علم ہو گیا کہ ان کے لیے راستہ صاف ہے تو تین گھنٹوں میں وہ پاکستان کی سرحد تک پہنچ جائیں گے۔ اگر انہوں نے فوری طور پر پیش قدمی شروع نہ کی تو کل صبح جب ان کے طیارے آئیں گے تو ان کے ہوا باز انہیں بتا دیں گے کہ راستہ صاف ہے پھر وہ فوراً پیش قدمی کریں گے۔

قبائلی ایک خوفناک خلا پیدا کر گئے تھے کشمیر میں کہیں اور یوں ہوتا تو کوئی زیادہ فرق نہ پڑتا

لیکن یہ خط اس سڑک کی وجہ سے اہم اور نازک تھا جو ایک اہم اور بڑی سڑک تھی اور یہ سڑک کشمیر کے سب سے زیادہ وسیع و عریض خطے میں سے گزرتی تھی اور اب یہ سڑک اس لیے بھی اہم اور نازک ہو گئی تھی کہ یہاں سے قبائلی جا چکے تھے اور ان کی جگہ لینے کے لیے کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو فوری طور پر بلایا جا سکتا تھا۔ قبائلیوں نے یہ علاقہ حیران کن تیزی سے لیا تھا اور اب یہ اسی تیزی سے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ اس کے اچانک دشمن کے قبضے میں چلے جانے سے سارے کشمیر میں لڑنے والوں کا سوال ختم ہوتا تھا اور تحریک آزادی پر بھی اس کا اثر تباہ کن ہو سکتا تھا۔۔۔۔ صورت بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔

اس محاذ کو فوراً سنبھالنا اور مضبوط کرنا لازمی تھا۔ مگر کیسے؟۔۔۔۔ یہ سوال پریشان کن تھا۔ اب یہاں لڑنے کے لیے قریب و جوار سے کشمیری آئیں گے یا پاکستان سے رضا کار آئیں گے مگر اس انتظام میں کئی دن ضائع ہو گئے تھے جب کہ یہاں صرف چند گھنٹوں کا کھیل تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر ہندوستانی اس خلا کو پُر کرکے آ رہے تھے۔ انہیں روکنا تھا۔

ہم نے اپنے ذمے یہ فرض لے لیا کہ ہم چند ایک پل تباہ کر دیں گے۔ اس سے دشمن کی پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ہم ایسے انداز سے کچھ کارروائی کریں گے جس سے دشمن کو یہ تاثر ملے گا کہ قبائلی ابھی تک یہیں ہیں۔ اس سے دشمن کی پیش قدمی اور زیادہ سست ہو جائے گی۔ اس طرح کچھ وقت اور مہلت حاصل کرکے ہم ارد گرد کے کشمیریوں سے ملیں گے اور رضا کاروں کی ایک فوج بنائیں گے۔

میں نے اپنی پارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے کو چند میل پیچھے جس بنانے کے لیے بھیج دیا۔ ہم چار آدمی اوڑی میں ہی رہے۔ دشمن ابھی تک آگے نہیں بڑھا تھا حالانکہ چھ گھنٹوں سے ان کے لیے دروازے کھلے تھے ہم خاموشی سے انتظار کرتے رہے۔ انتظار کے سوا ہم اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ کوئی حرکت نہ ہوئی تین اور گھنٹے گزر گئے۔

چار آفریدی جانباز

رات جاگتے گزر گئی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا جب دور سے ہمیں عقب سے ایک گاڑی

کی بتیاں نظر آئیں۔ کوئی ہماری طرف آ رہا تھا۔ یہ امید افزا منظر تھا۔ رات بھر لوگ ہم سے رخصت ہوتے رہے تھے۔ اب کوئی ہمارے پاس آ رہا تھا۔ گاڑی ہمارے پاس آ رکی۔ یہ ایک جیپ تھی جس میں چار آفریدی سپاہی تھے۔ ایک کا نام خیال اکبر تھا۔ وہ پاکستان کی باقاعدہ فوج کے سپاہی تھے اور وہ کشمیر میں لڑنے کے لیے اپنی یونٹ سے بھگوڑے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ انہوں نے بھاگنے کا فیصلہ اچانک کیا تھا۔ ہتھیار نہ چرا سکے۔ یہ جیپ ملی تو اسی کو چرا کر کشمیر میں آ گئے۔ چاروں جوشیلے اور پُرعزم تھے۔ راستے میں انہیں قبائلی ملے تھے جو کشمیر سے واپس جا رہے تھے۔ کئی ایک قبائلیوں نے انہیں کہا تھا کہ واپس چلے چلیں کیونکہ جنگ ختم ہو چکی ہے لیکن ان چاروں کا ارادہ نہ بدلا۔ انہوں نے چند ایک قبائلیوں سے کہا تھا کہ انہیں اپنی رائفلیں عاریتاً دے دیں مگر انہیں کسی نے اپنی رائفل نہ دی۔ پھر بھی وہ آ گئے اور جب میں نے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور انہیں کہا کہ اگر وہ چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں وہ ثابت قدم رہے اور پُرعزم انداز سے بولے کہ وہ میرے ساتھ رہیں گے اور لڑیں گے۔

صبح طلوع ہونے میں ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی دشمن کی فوج اور فضائیہ کی سرگرمیاں شروع ہوئی تھی۔ میں نے دشمن کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ قبائلیوں کا لشکر یہیں ہے ان چاروں آفریدی سپاہیوں کو رائفلیں اور ایک مشین گن دے کر آگے بھیج دیا اور انہیں ہدایت دی کہ ہندوستانی کالم کے ہراول پر فائر کریں۔ عین اس وقت ہندوستانیوں نے توپوں کے دہانے کھول دیے لیکن وہ جہاں گولہ باری کر رہے تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ہم گولہ باری سے دور اور محفوظ تھے۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ ہندوستانی بہت ہی محتاط تھے۔ ابھی تک انہوں نے پیش قدمی شروع نہیں کی تھی نہ وہ جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ وہ صرف گولہ باری پر اکتفا کر رہے تھے۔ ہمارے چار جوان ان پر چھ راؤنڈ فائر کرتے تھے تو ان کے جواب میں ہندوستانی چھ ہزار راؤنڈ فائر کرتے تھے۔ سودا بُرا نہیں تھا۔ ہم وقت حاصل کر رہے تھے اور اس طرح کئی گھنٹے گزر گئے ان کے طیارے صبح کا اجالا نکھرتے ہی سارے علاقے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ وہ بم بھی گرا رہے تھے اور مشین گنیں بھی فائر کر رہے تھے۔ انہیں بالکل علم نہیں تھا کہ جہاں وہ بمباری اور مشین گن فائرنگ کر رہے ہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔ بہرحال وہ ہوا میں تیر چلانے

میں مگن رہے اور ہمارے چند ایک آدمی اوڑی کے قریب ایک پل برباد کرنے میں لگے رہے۔ دن کے پچھلے پہر پل برباد کر دیا گیا جس سے ہمیں بہت اطمینان ہوا۔

آخر ہندوستانیوں کا ہراول آیا۔ جوں ہی دشمن کا یہ دستہ پل کے قریب پہنچا اس پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی۔ ہندوستانی رک گئے۔ انھوں نے اندھا دھند جوابی فائر کیا لیکن آگے بڑھنے کی جرأت نہ کی۔ شام کی تاریکی پھیلنے لگی۔ اس سے وہ اور زیادہ محتاط ہو گئے۔ رات پوری طرح تاریک ہو گئی تو ماحول بالکل خاموش ہو گیا۔ ہمارے لیے یہ خاموشی سود مند تھی کیونکہ ہم اڑتالیس گھنٹوں سے سوئے نہیں تھے۔

صبح کا دھندلکا ابھی نکھرا نہیں تھا کہ ہمارے جوانوں نے دشمن پر فائر کیا اور پیچھے ہٹ آئے اور جب ہندوستانیوں نے کئی گھنٹوں تک تمام علاقے میں توپوں اور گولیوں کا مینہ برسایا، ہم کہیں اور تھے۔ کچھ آدمی ایک اور پل برباد کر رہے تھے اور باقی کبھی نالے کے اس طرف آتے کبھی اس طرف جاتے کبھی اس پہاڑی پر جا کر دشمن پر چند ایک راؤنڈ فائر کرتے کبھی دوسری پہاڑی سے جا فائر کر لگے تاکہ دشمن کو یہ دھوکا دیا جائے کہ یہاں ہر پہاڑی پر اور ہر جگہ قبائلی موجود ہیں۔ دشمن بھی صحیح پوزیشن سمجھ نہ سکا۔

اس جانفشانی سے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ دشمن پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا اور آگے نہ بڑھا۔ ہمارا دھوکا کامیاب تھا، حالانکہ دشمن کا ہراول اوڑی کے مضافات تک آ گیا تھا لیکن اصل فوج ایک دن بعد پہنچی۔ ہم نے ابتدا انھیں وہاں سے دائیں بائیں نہیں جانے دیا۔ انھیں سڑک پر ہی پیش قدمی کرنی پڑی۔ اگر وہ سڑک سے ہٹ کر سارے علاقے میں پھیل جاتے تو کئی جگہوں سے ندی نالے عبور کر سکتے تھے مگر ہم نے انھیں سڑک پر پابند رکھ کر یہ فائدہ حاصل کیا کہ ہندوستانیوں کو سڑک کے ہر ایک پل پر قبضہ کرنا پڑتا تھا جس میں وقت ضائع ہوتا تھا۔ ہمارے پاس پل اڑانے کا سامان نہیں تھا، اس لیے ہم اتنی جلدی ہر ایک پل اڑا نہیں سکتے تھے۔ اس کی بجائے ہم نے قریبی پہاڑیوں سے ہندوستانی کالم پر فائرنگ جاری رکھی اور انھیں تاثر دیتے رہے کہ ہماری نفری تھوڑی نہیں۔ یہ کام بھی آسان نہیں تھا۔ ہم پہاڑیوں اور ٹیکریوں پر اترتے چڑھتے اور دوڑتے شل ہو چکے تھے لیکن وقت حاصل کرنا تھا۔

ہم نے ایک دن کا وقت حاصل کر لیا۔ دوسرے دن ہم نے دشمن کو خاصا جانی نقصان بھی پہنچایا۔ تیسرے دن کی شام کو میں نے محسوس کیا کہ ہم نے مقصد پورا کر لیا ہے۔ دشمن کی

پیش قدمی بہت ہی سست رفتاری سے ہو رہی تھی۔ سارا کام ہم چند ایک آدمی ہی جنگل میں کر رہے تھے
ہر لمحہ توقع تھی کہ کوئی نہ کوئی ہماری مدد کو آ جائے گا اور ہندوستان کی فوج کو روک دے گا۔ رات
کو ہم پیچھے کو دیکھتے تھے۔ شاید کوئی آ جاتے مگر کوئی نہ آیا۔ اگلے روز ہمیں پہلے دنوں کی طرح
پہاڑیوں پر چڑھنا، اترنا، فائر کرنا اور بھاگنا دوڑنا پڑا۔ اس دوران ہم نے ہر روز ایک پل بھی
توڑا۔ ہر روز دشمن وہاں آ کر رک جاتا تھا اور ادھر ادھر سے راستہ بنا کر گزرتا تھا۔

پاکستانی رضاکار۔ آئے اور گئے

پچھلے روز ہم اوڑی سے چند میل دور چھوٹی بڑی میں رک گئے۔ یہاں ہم نے ایک گہرے نالے
کے اوپر ایک پل توڑ دیا۔ یہاں نالے کے کنارے اتنے اونچے تھے کہ گاڑیوں کے لیے کوئی
متبادل راستہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ یہاں سے گزرنے کے لیے ہندوستانیوں کو نیا پل بنانا ضروری
تھی۔ جب ان کی سپاہی گشتی پارٹی پل کے قریب آئی تو ہم نے تمام ہتھیاروں سے فائر کر کے
ان کا استقبال کیا۔ ہندوستانی ایک گاڑی اور دو لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک
اور پارٹی آئی۔ اس کا بھی ہم نے یہی حشر کیا۔ بھارتیوں نے حسب عادت بے پناہ گولہ باری،
چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی فائرنگ اور ہوائی حملے شروع کر دیے۔ یہ قیامت سورج غروب
ہونے تک جاری رہی۔ رات کو حسب معمول خاموشی طاری ہو گئی۔ صبح کے وقت ہندوستانیوں
نے پھر حرکت کی۔ ہماری رائفلوں نے انہیں روک لیا۔ انہوں نے ہماری دائیں طرف سے
انفنٹری بٹالین سے حملہ کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے حملہ شروع کر دیا۔

ہو سکتا ہے ہندوستانی اوڑی سے اس سمت نہ آنا چاہتے ہوں اور ان کا ارادہ جنوب
کی سمت پونچھ تک جانے کا ہو جہاں ہندوستانی فوج کو مدد کی ضرورت تھی۔ ہم مظفرآباد تک
کے علاقے کو وہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اگر راستے میں مزاحمت نہ ہوتی تو وہ اس اہم علاقے
کو ضرور لے لیتے۔

ہم چھ روز شدید سردی میں لڑتے رہے۔ راتوں کو پل برباد کرتے رہے۔ ہم نے بہت
مصائب جھیلے۔ دشمن ہمارا کوئی نقصان نہ کر سکا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کشمیر کی چٹانوں اور گھاٹیوں
میں دشمن ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کی کوئی گولی اور کسی توپ کا گولہ ہمیں نہیں لگ سکتا۔

اگلے ہی روز موت نے ہمیں ایسی جگہ آن دبوچا جہاں کوئی معجزہ ہی ہمیں بچا سکتا تھا۔ میں اپنے تین ساتھیوں کو سٹیشن ویگن پر پیچھے لا رہا تھا۔ ایک میل لمبی سڑک بالکل سیدھی تھی۔ دائیں بائیں چھپنے کی کوئی قریب جگہ نہیں تھی۔ مجھے اچانک ایک بھارتی طیارہ نظر آیا جس نے ہم پر غوطہ لگا دیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ چھپنے کی صرف ایک جگہ تھی جو دو سو گز پیچھے رہ گئی تھی۔ وقت نہیں تھا کہ ہم گاڑی روک کر اس میں سے باہر کود کر اور بھاگ کر دو سو گز پیچھے پہنچ جاتے۔ طیارہ غوطے میں آ رہا تھا۔ اس کی مشین گنیں فائر ہونے ہی والی تھیں۔

ہم سمجھ گئے کہ گھڑیاں ختم ہیں۔ میں نے سوچا یا اتنی تیز دوڑ کا یہ انعام ہے جو میں چوہوں سے قوت آزمائی ہوئی اور فیصلہ کیا کہ بھارتی ہوا باز کو سبق نہ گیٹ نہیں دوں گا۔ میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی تا کہ طیارے کی گولیاں پیچھے کو چلی جائیں مگر گولیاں دائیں آگے گئیں نہ پیچھے۔ گاڑی کی چھت میں سے اندر آئیں جن سے ہمارا ایک ساتھی شہید ہو گیا۔

ان سات دنوں میں ہم نے صرف دشمن کو ہی نہ روکا اور پیچھے نہیں تھوڑے سے جلد گرد و نواح کے علاقے میں جو مقامی باشندے رہ گئے تھے انہیں سے اور ان میں سے کچھ رضاکار تیار کر لیے۔ اب وہ ہمارے ساتھ آنے کو تیار تھے۔ آزاد کشمیر کی صورت بھی رضاکار اور ہتھیار رکھنے لگی تھی۔ اس سے امید بندھ گئی تھی کہ مدد آ رہی ہے۔ باغ اور پونچھ کے علاقوں سے پیغام بھی ملے تھے کہ وہ مدد بھیج رہے ہیں مگر وہ ابھی اپنے جنگی مسائل سے دوچار تھے۔

دوسرے دن جب جنگ بندی کا اعلان ہونے کے لیے تیاری ہو رہی تھی، پاکستان سے تین سو بچاس رضاکار آ گئے۔ ان میں بیشتر سابق فوجی تھے۔ ہر ایک کے پاس رائفل تھی اور بھی پر عزم نظر آتے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی کہ اب ہم خوشحال نہیں گے —— مگر یہ بھی یہ بھی ثابت ہوئی۔ تشنہ اور ناکام!

یہ خود رضاکار تھے تو بیشتر سابق فوجی مگر دشمن کے اتنا قریب جانے سے جھجکنے لگے جہاں سے دشمن انہیں زد میں لے سکتا ہو۔ وہاں دشمن کو روکنے کا یہی طریقہ موزوں تھا جس پر ہم کئی روز سے عمل کر رہے تھے۔ یعنی چھپ کر دشمن پر ایک دو راؤنڈ فائر کرو اور پوزیشن چھوڑو۔ دوسری جگہ پر جاؤ۔ دشمن کے قریب ہو کر فائر کرو اور پیدل دوڑتے پیچھے جاؤ مگر ان رضاکاروں کو ہم نے دشمن پر بھیجا تو وہ بھاگ آئے۔ وہ دشمن کی زد میں جانے سے گھبراتے تھے اور جونہی دشمن کا فائر آتا تھا وہ پوزیشن میں رہنے کی بجائے بھاگ آتے تھے

کئی دنوں تک انہوں نے ایسا ہی مظاہرہ کیا اور ہر روز میرا علم اور اس کے پیچھے والے دو
تین ساتھی پہاڑیوں میں ایسے سو جاتے تھے۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے انہیں اس طرح
استعمال کیا کہ انہیں اتنی دور پہاڑیوں میں پھیلا دیا جہاں تک دشمن کا فائر نہیں پہنچ سکتا تھا
میری ہدایت کے مطابق وہ وہاں "ٹھوں۔ ٹھاں" کرتے رہتے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ دشمن

اپنی طاقت کے متعلق دھوکا دوں میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ مگر اتنی دور بھی کوئی جیپ والا
گزر جاتی تھی یا دشمن کا طیارہ اوپر سے گزر جاتا تھا تو یہ سارے تین سو رضاکار ہراساں ہو کر
بھاگ اٹھتے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک سو دریا کے کنارے بھیج دیا۔ یہ جگہ ان کے لیے محفوظ تھی
اور یہاں سے وہ دشمن کے پیش قدمی کرتے ہوئے کالم کے آخری حصے پر فائر کر سکتے تھے۔ ایک
انہیں دریا کی رکاوٹ حاصل تھی اور دوسرے چھپنے کے لیے چٹانیں بھی تھیں۔ وہ دن کے پچھلے پہر
کا تمام وقت وہاں بیٹھے رہے۔ ان کے سامنے سے دشمن کا کانوائے تین سو گز سے کم فاصلے پر
گزر رہا۔ سڑک تنگ تھی۔ دشمن کی ان گاڑیوں کی حفاظت کے لیے کسی پہاڑی پر پکٹ نہیں تھی
نہایت آسان ٹارگیٹ تھا مگر وہ سے ایک سو رضاکار دشمن کی گاڑیوں کو گزرتے دیکھتے رہے
اور ایک بھی گولی نہ چلائی۔ وجہ یہ تھی کہ انہیں ڈر تھا کہ اگر انہوں نے گولی چلائی تو دشمن جوابی
فائر کرے گا —— آخر ان ایک سو رضاکاروں میں سے بانوے (۹۲) محاذ سے ہی بھاگ گئے۔

اس وقت تک وہ دو سو واپس آ چکے تھے۔ ان پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا مگر دشواری
یہ تھی کہ وہ باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنے کے طور طریقوں سے واقف نہیں تھے۔ میں نے
انہیں ایک بار سڑک اور ان راستوں کی نگہبانی کے لیے استعمال کیا جہاں سے بھگوڑے محاذ سے
بھاگ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھگوڑے پہاڑی علاقے میں سے نکل گئے اور وہ رائفلیں بھی
اپنے ساتھ ہی لے گئے جو انہیں کیمپ سے دی گئی تھیں۔

ابھی اور رضاکار آ رہے تھے مگر کسی نہ کسی وجہ سے موجودہ صورت حال انہیں پسند نہ آئی
کچھ تو ایسے تھے کہ آتے۔ ایک نظر محاذ کو دیکھا اور واپس چلے گئے۔ بعض ایک ہی بار کسی پہاڑی
پر چڑھے اور اسی میں ان کا جذبۂ جہاد سرد پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی نظر نہیں آتے۔ میں
انہیں روک نہیں سکتا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رضاکار چلے آ رہے تھے جو آتے تھے
میں ان کی حوصلہ شکنی نہیں کرتا تھا۔ ان کے صرف آ جانے اور بھاگ جانے سے بھی میرا یہ

مقصد پورا ہو جاتا تھا۔ دشمن سمجھ رہا تھا کہ ہماری طرف بہت سرگرمی ہے اور ہم بہت بڑی فوج میں یہ رضاکار وادیوں پر آ گئے تھے۔ دشمن کے جاسوس یقیناً خبریں دے رہے تھے کہ رضاکاروں کی فوج آ رہی ہے لیکن یہ رضاکار چونکہ پہاڑی علاقے کے اندر اندر چھپ کر جا رہے تھے اس لیے جاسوسوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ انہیں یہی کچھ نظر آ رہا تھا کہ رضاکار پیش قدمی کر رہے ہیں اور پہاڑوں میں پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

پچھتر رضاکار جو فرسٹ مظفرآباد بٹالین بنے

ہم دشمن کو جس طریقے سے پریشان کر رہے تھے اسے کہتے ہیں — "ضرب لگاؤ اور بھاگو"۔ مگر رضاکار وہ طریقے استعمال کر رہے تھے — "دیکھو اور بھاگو" — یا صرف "بھاگو" —
ان میں جو سابق فوجی تھے وہ میرے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ان سے کام لینے کے لیے غالباً کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ فوج میں رہ کر وہ ایک خاص نظام کے عادی ہو گئے تھے۔ ٹریننگ کے مطابق وہ اسی نظام کے تحت رہ سکتے تھے۔ مثلاً سپلائی، مواصلات، طبی امداد، کمک، طلب، پیش قدمی اور پیچھے ہٹنے کا خاص انداز وغیرہ۔ ہمارے پاس ایسا کوئی نظام نہ تھا۔ ہر ایک آدمی اپنی ذمہ داری پر تھا۔ وہاں نہ تو تنخواہ تھی نہ ڈبل راشن جو میدان جنگ میں دیا جاتا ہے اور نہ ہی ہم انہیں کوئی اور رعایت دے سکتے تھے۔ انہیں کنٹرول کرنے کے لیے کوئی افسر نہیں تھا نہ ہی حکم عدولی اور خلاف ڈسپلن حرکت پر سزا دی جاتی تھی۔ ان میں بعض خود سیکشن کمانڈر، پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈر بن گئے تھے مگر خود وہ کسی کے حاکم نہیں تھے۔ اگر وہ لوگ ان کے ساتھ ہوتے جنہوں نے انہیں محاذ پر بھیجا تھا تو شاید وہ انہیں قابو میں رکھ سکتے۔ مجاہد اکیلے ہی بارود دشمن کے سامنے سامنے آتے تو وہ تتر بتر ہو گئے — ان میں کچھ ایسے بھی آئے تھے جنہوں نے لڑنے کا یہ جواز پیش کیا کہ یہ "صرف کیا تھی" ہے اور واپس جاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ جو رضاکار یہاں لڑنا چاہتے ہیں وہ پاگل ہیں۔
یہ لوگ محض جذباتیت کے زیر اثر اور نام نہاد جذبہ جہاد کے تحت آ جاتے تھے مگر جہاد کے عملی پہلو کو دیکھ کر ان کے جذبات حباب کی طرح اڑ جاتے تھے۔

ہم اس ہجوم میں سے جو آتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ ایک نیا عنصر ابھرنے لگا۔ ایسے افراد

سامنے آ گئے جو سنجیدگی سے لڑنا چاہتے تھے، صورت حال کو سمجھتے تھے۔ وہ کشمیری کو ایک آزادی یا جنگ آزادی کا بنیادی جزو بنتے جا رہے تھے۔ وہ کشمیری مسلمانوں کے دوش بدوش رہ کر کشمیر کو ہندوستان اور مہاراجہ سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ مقامی لوگوں میں کشمیری مسلمانوں پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اس ضلعے کے لوگوں کو جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے ہتھیار اٹھائے تھے۔ لہٰذا لڑنے کے قابل ہونے کے لیے انہیں وقت درکار تھا لیکن وہ جلدی میں تھے۔ ان کی آزادی ان کی نگاہ میں محسوس معنی رکھتی تھی۔ اس وقت ایسے سنجیدہ اور کچھ کر گزرنے کا عزم رکھنے والوں کی تعداد صرف کچھ تھی لیکن چند ہی ہفتوں بعد وہ آزاد کشمیر کی فرسٹ مظفر آباد بٹالین بن گئے جس کا پہلا بٹالین کمانڈر، ریاست کشمیر کی فوج کا سابق لیفٹیننٹ قدرت اللہ مقرر ہوا۔

پٹھان کفارہ ادا کرنے کو لوٹ آئے

اُس وقت تک قبائلیوں نے بھی جنگ میں واپس آنے کے متعلق گفت و شنید شروع کر دی تھی۔ وہ کھسیانے سے تھے اور معذرت خواہ۔ کہتے تھے کہ وہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی ضرورت تو ہمیں شدید تھی لیکن اب کے انہیں پوری طرح کنٹرول میں رکھنے کے لیے میں نے صرف تین سو محسود قبائلیوں کو آنے کی اجازت دی۔ ان کا لیڈر گلاب خان بڑے جوشیلے اور کردار کا مالک تھا اور بلاشک و شبہ ایسا انسان تھا جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ان کے لیڈروں کا فرض منتقل کرنے میں یہ جانتا تھا کہ محسود قبیلے کے پٹھان تمام قبائل سے زیادہ منہ زور اور بے لگام ہوتے ہیں لیکن جارحانہ قسم کے لڑاکے بھی ہیں۔ وہاں ایسے ہی لڑنے والوں کی ضرورت تھی۔ وہ ابھی تک حیران تھے کہ پاکستان کشمیر میں لڑنے کے لیے کیوں نہیں آتا لیکن محسود حقیقت پسند اور عمل پسند لوگ ہیں۔ ان کے دلوں میں جو کچھ تھا وہ انہوں نے مجھے کہہ سنایا اور جو فرض ان کے ذمے تھا، وہ پورا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

میں نے دوسرے دن انہیں پہاڑیوں پر بھیج دیا۔ انہیں پہاڑیوں پر ہندوستانی دشمنوں کو نظر انداز کر کے اور ان سے بچتے ہوئے اوڑی تک کا پندرہ میل کا فاصلہ طے کرنا

تھا۔ وہاں سے انہیں جنوب کی طرف اوڑی سے پونچھ جانے والی سڑک پر جانا تھا۔ پونچھ
میں ریاست کشمیر کی فوج مجاہدین کے گھیرے میں آئی ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا محاصرے
میں آئی ہوئی گیریژن کو مدد دینے کے لیے ہندوستانی فوج کے دستے جا رہے ہیں۔ میں نے

نقشے پر ایک جگہ کی نشاندہی کی اور قبائلیوں کو بتایا کہ وہ اس مقام پر ہندوستانی کمک کو گھات لگائیں
قبائلی بروقت اس مقام تک پہنچ گئے اور ادھر ادھر چھپ گئے۔ دوسرے ہی دن
ہندوستانیوں کا ایک کنوائے گھات کے اندر چلا گیا۔ قبائلی ایسے شکار کے ماہر ہوتے ہیں
وہ اپنے مخصوص انداز اور رفتار سے کنوائے پر ٹوٹ پڑے۔ ہندوستانی فوج کے چھتیس ٹرک
جل کر راکھ ہو گئے اور بے شمار ہندوستانی مارے گئے۔ قبائلی پہاڑیوں میں ہوتے ہوتے واپس
آ گئے۔ وہ ہتھیاروں کی بہت بڑی تعداد، بے اندازہ ایمونیشن، فوجی کپڑے وغیرہ دیگر جنگی
سامان جس میں وائرلیس سیٹ بھی تھے، فیلڈ ٹیلیفون اور کچھ مارٹر گنیں اٹھا لائے۔
انہیں دیکھ کر فضا نعروں سے گونج اٹھی ۔۔۔ "غازیوں کا پیچھا کرو" ۔۔۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے
فضا میں برقی رو دوڑ گئی ہو۔

اب ہم نے پیش قدمی شروع کر دی۔ ہمارا طریقہ بالکل قبائلی تھا۔ ہراول پر ہم پہاڑیوں
سے فائر کرتے تھے اور اس کے پہلوؤں سے آگے نکل جاتے تھے۔ یہ ایسی چال اور ایسا طریقہ
تھا جو ہندوستانیوں کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ پہاڑیوں سے اپنی پوزیشنیں چھوڑ چھوڑ کر
بھاگنے لگے اور ہم ان کا تعاقب کرنے لگے حتیٰ کہ ہم اوڑی کی دفاعی فصیل تک پہنچ گئے
یہ نومبر کے آخری دن تھے۔ تین ہفتے پہلے یہ محاذ ڈھیر ہو گیا تھا اور ہندوستانی چکوٹھی
اور پونچھ تک پیش قدمی کر گئے تھے۔ اب ہم نے انہیں پونچھ سے کاٹ دیا، چکوٹھی سے پیچھے
دھکیل دیا اور محاذ اوڑی کے گرد قائم کر لیا۔

لیکن محاذ ابھی تحقیقی محاذ نہیں تھا۔ میں ایک دن صبح چکوٹھی سے اوڑی گیا۔ مجھے نہ
کوئی دوست ملا نہ دشمن۔ چکوٹھی اور اوڑی کے درمیان سڑک سے ایک میل ہٹ کر ایک
پہاڑی پر ہماری ایک پوسٹ تھی جس میں چند ایک آدمی تھے۔ قبائلی اور کشمیری غائب کہیں اور
تھے۔ ان کی تعداد اس قدر کم اور علاقہ اس قدر وسیع تھا کہ مجھے کوئی آدمی بھی نظر نہیں آتا
تھا تاہم ہندوستانی فوج اس حد تک مغلوب اور دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ وہ اوڑی کے اندر
چلی گئی تھی اور پیچھے ایک پل توڑ گئی تھی۔ پہلے ہم پل توڑ کر انہیں روکتے رہے تھے، اب وہ

لیٹ کر بم سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میدان جنگ گرم ہو گیا

میں روحانی سکون سے کچھ لیس ہو کر واپس آیا۔ اب ضرورت یہ تھی کہ وہاں کے مقامی باشندوں کو مسلح کر کے انہیں ٹریننگ دی جائے۔ اس کے لیے کئی ہفتے درکار تھے۔ اس عرصے میں قبائلیوں کا سرگرم رہنا ضروری تھا تاکہ ہندوستانی بپھر کر آگے نہ بڑھ آئیں۔ اس مقصد کے لیے میں نے مزید قبائلی بلا لیے۔ وہ آئے تو میں نے انہیں مختلف اور الگ کام دیے۔ ان میں آفریدی بھی تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کے لیڈروں میں سے دو میرے کلاس فیلو تھے ان پر براہ راست کنٹرول کی ضرورت نہیں تھی میں نے انہیں یہ فرض سونپ کر پونچھ روانہ کر دیا کہ پونچھ کے محاصرے کو مضبوط کریں اور پونچھ روڈ کو بند رکھیں یعنی دشمن کو کمک نہ پہنچنے دیں۔

محسود قبائلیوں کو یکجا ہونے کے لیے ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ یہ قبائلی سرینگر کے باہر ہوتے ہوئے سنگ میل پر پہنچ چکے تھے۔ محسود قبائلی فوری طور پر ایکشن کے لیے تیار تھے۔ میں انہیں ساتھ لے کر اوڑی چلا گیا۔ ہماری منزل اوڑی کے مغرب کی طرف گوالن نام کا ایک گاؤں تھی۔ سڑک سے ہٹ کر ہم سات ہزار فٹ بلند سلسلۂ کوہ سے گزر کر گئے جہاں دو تین فٹ برف بھی پڑی ہوئی تھی۔ ہمیں منزل تک پہنچنے میں دو دن لگے۔ دشمن کو ہمارے اجتماع کا علم ہو گیا تھا۔ اگلی صبح سویرے تین طیاروں نے ہم پر حملہ کیا۔ ہم کچے مکانوں میں تھے۔ وہیں پھنس گئے۔ چھت ہمارے اوپر گری۔ دیواروں کو گولیوں نے چھلنی کر دیا۔ اللہ نے فضل کیا کہ ہم میں سے کوئی زخمی بھی نہ ہوا۔ وہاں کی زمین نے ہماری مدد کی جو اونچی نیچی تھی۔ بم ادھر گرے یا ہم سے دور گرے۔

اس کے بعد ہم پر دو اور ہوائی حملے ہوئے۔ وہی قبائلی جو پہلے کشمیر سے نکل گئے تھے کہ ہندوستان کے طیارے آتے ہیں تو پاکستان کے طیارے کیوں نہیں آتے، اب طیاروں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اب کے انہوں نے کوئی شکایت نہ کی۔ کوئی ایک بھی آدمی زخمی تک نہ ہوا لیکن آل انڈیا ریڈیو نے خبر نشر کی کہ کشمیر کے ایک گاؤں گوالن میں ہندوستانی طیاروں کی بمباری سے تین سو قبائلی مارے گئے ہیں۔

مارٹر اور مجاہد

دن کے پچھلے پہر قبائلیوں نے اوڑی کے پیریمیٹر کے شمال، مغرب اور جنوب کی طرف پوزیشنیں لے لیں۔ ایک پارٹی اور آگے بڑھ گئی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ عقب میں جا کر سرینگر سے اوڑی آنے والی سڑک کو روک لیا جائے۔ ایک گروپ کو میں نے اپنے ساتھ اس مقصد کے لیے تیار رکھا کہ موقع ملے تو اوڑی میں داخل ہو جائے۔ انہیں اگلے دن بارہ بجے فائرنگ کی ابتدا کرنی تھی۔ آگے بڑھ کر حملے موقع و محل کے مطابق کرنے تھے۔ بارہ بجنے کے لیے میں نے دشمن کے لیے ایک حیران کن چیز رکھی ہوئی تھی۔ ہم اپنے ساتھ فوج کے بارہ رضاکار لائے تھے۔ ان کے لیے ہمارے پاس تین ۳ مارٹر گنیں اور اڑھائی سو گولے تھے۔ ان سے ہمیں دشمن کے کیمپ کے وسط میں گولہ باری کرنی تھی جہاں اس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مارٹر گنوں کی گولہ باری کے ساتھ ہی قبائلیوں کو فائر کھولنا تھا ——— یہ مارٹر گنیں دشمن سے ہی چھینی ہوئی تھیں۔

میں نے مارٹر گنیں ایسی محفوظ جگہ لگوائیں جہاں سے اڑھائی ہزار گز کے رینج پر ٹارگیٹ کو مار سکتی تھیں۔ ان سے ایک ہزار گز آگے میں ایک پہاڑی پر بیٹھ گیا جہاں سے مجھے اوڑی کیمپ اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ مارٹر گنوں نے میرے اشارے پر گولہ باری شروع کرنی تھی۔

صبح کا وقت گزرنے لگا۔ ہندوستانی طیارے آتے اور چکر لگا کر چلے جاتے تھے یا ہندوستانی توپ خانے کا اکا دکا گولہ کبھی یہاں کبھی وہاں گرتا تھا۔ مگر گولا بے مقصد ثابت ہو رہا تھا ——— دن کے بارہ بج گئے۔ میں نے پہاڑی سے مارٹر گنوں کی گولہ باری کرنے کا اشارہ دے دیا اور اس انتظار میں میری سانسیں رک گئیں کہ ابھی ہندوستانیوں کے کیمپ میں سب دھماکے ہوں گے اور وہ پیچھے آ رہے ہوں گے جو ہندوستانی ہم سے وصول کریں گے ——— مگر میری سانسیں رکی رہیں اور ادھر سے کوئی گولا فائر نہ ہوا۔ نہ ادھر کوئی دھماکا ہوا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ فوج کے ان رضاکاروں کو مارٹر گنیں فائر کرنے کے لیے متعین کیا گیا

تھا وہ پانا کھیل گئے ہیں۔ انہوں نے اس ذمے فائر دیا کر جواب میں ہندوستانی گولہ باری کرنے لگے چنانچہ وہ چوکیاں وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

قبائلی بھی مورچوں کی گولہ باری کا انتظار بے تابی سے کر رہے تھے۔ بارود کے پکے تھے آخر انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ فائرنگ شروع کر دی۔ دو دن تک انہوں نے ہندوستانیوں کا ناک میں دم کیے رکھا۔ ہندوستانی دل کھول کر جوابی فائرنگ اور گولہ باری کرتے رہے۔ ان دو دنوں میں قبائلیوں نے ہندوستان کی گشتی پارٹیوں کو گھات لگائی۔ مگر کیمپ پر قبضہ ہونے والی قوتوں کا ایمونیشن ختم ہو چکا تھا۔ گو ہاں میں راشن بھی ختم ہو چکا تھا ایمونیشن بھی۔ تیسرے دن بے پناہ برف باری شروع ہو گئی۔ میں قبائلیوں کو پیچھے لے آیا۔

اوڑی کے اندر دشمن کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ ہندوستانی بریگیڈ کا کمانڈر وائرلیس سے سرینگر کو رپورٹ دے رہا تھا کہ وہ اوڑی کو زیادہ دیر تک قبضے میں نہیں رکھ سکتا۔ ہمارے پاس بھی وائرلیس سیٹ تھا۔ میں بھی یہ وائرلیس پیغام سن رہا تھا۔ ہندوستانی بریگیڈ کمانڈر اوڑی سے پسپائی کی اجازت مانگ رہا تھا مگر اس کے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

میرا اندازہ ہے کہ ہم نے دشمن کے دو سو پچاس آدمی ہلاک اور زخمی کیے تھے۔ جنرل عزروی کو ہندوستان کے کمانڈر انچیف نے بتایا تھا کہ ہندوستانیوں نے اپنا جانی نقصان ایک سو بتایا ہے۔ انہوں نے ہمارا جانی نقصان بہت ہی زیادہ بتایا تھا۔ یعنی سات آٹھ سو جب کہ حقیقت یہ تھی کہ صرف گیارہ قبائلی شہید ہوئے تھے۔

گوالن میں بھی کھیل ختم ہو گیا۔ یہ دسمبر کا وسط تھا۔ تمام علاقہ برف سے دب گیا تھا۔ ہر وقت برف باری ہوتی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ موسم سرما تک ہمارا محاذ ٹھیک رہے گا۔

نواں باب

کشمیریوں اور قبائلیوں کو ایک مرکز پر لانا ضروری تھا

چند دنوں بعد مجھے آزاد کشمیر کے جی ایچ کیو میں بلایا گیا۔ وہاں میں سردار ابراہیم اور ان کی کیبنٹ سے ملا۔ ڈیفنس کمیٹی جو نئی نئی بنائی گئی تھی میں اس کا ممبر تھا۔ اس حیثیت سے مجھے اس کمیٹی کو اور میجر کو صورت حال کا جائزہ دینا پڑا تاکہ جلد سے جلد کوئی موزوں پالیسی مرتب کی جا سکے۔

کشمیر میں جو مسلح بغاوت شروع ہو گئی تھی اس کا ایک مقصد تو ذاتی دفاع تھا اور دوسرا مقصد تھا عمومی آزادی۔ ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا ارادہ کبھی بھی پیش نہیں کیا گیا تھا مگر ہندوستان کی فوجی مداخلت نے ایک ہی ضرب سے کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی کا انداز ہی بدل دیا۔ عوام کی امیدوں کے دریچے بند ہو گئے۔ اگر ہندوستان اپنی فوج کو امن کی بحالی کے لیے ایک غیر جانبدار فورس کی حیثیت سے کشمیر میں بھیجتا اور کشمیر کے سیاسی ڈھانچے کو جوں کا توں رہنے دیتا تو اس کے اثرات بالکل ہی مختلف ہوتے۔ اس صورت میں شاید پاکستان بھی ریاست میں امن کی بحالی کے لیے ہندوستان کی مدد کرتا۔ کشمیری عوام کے پاس مسلح تحریک جاری رکھنے کے لیے کوئی جواز ہی نہ رہتا کیونکہ انہیں یقین ہو جاتا کہ ہندوستان اور پاکستان انہیں مہاراجہ کے ظلم و تشدد سے بچاتے رہیں گے اور ان کے حق خود ارادیت کا تحفظ کرتے ہوئے ان کی خواہشات کے مطابق کشمیر کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرا دیں گے۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ ہندوستانیوں نے ایسا فوجی اقدام کیا جو کشمیری عوام کے لیے کھلا اعلان تھا کہ ہم کشمیر میں اس لیے فوج لا رہے ہیں کہ مہاراجہ تم پر حکمرانی کرتا رہے اور اب ریاست جموں کشمیر

ہندوستان کی ملکیت ہے — گو ہندوستان کا یہ استبداد چینی چڑھی گولیوں کی مانند تھا کیونکہ اس کے ساتھ یہ وعدہ بھی شامل تھا کہ کشمیر میں قیامِ امن اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کرائی جائے گی ایسے وعدے سے تو ایک معمولی سا ذہن بھی متاثر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ وعدہ نہیں فریب تھا۔

فوری طور پر جو نتائج سامنے آئے وہ یہ تھے کہ آزادی کی جدوجہد جو پہلے احتجاج اور مطالبے تک محدود تھی اب اس لامحدود کارروائی کی صورت اختیار کر گئی جس میں افراد نے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی اپنے آپ کو ریاست سے الگ کر دیا اور ریاست کے خلاف محاذ بنا لیا۔ اس سے ریاست کے ٹکڑے ہونے لگے۔ دور اوپر شمال میں گلگت کا تمام تر علاقہ ہنزہ، ہونچی اور استور وغیرہ جن کا رقبہ تقریباً ستر ہزار پانچ سو مربع میل تھا، ریاست سے کٹ چکا تھا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی نصف شب جب کشمیر کو ہندوستان سے الحاق کیے چار روز گزر گئے تھے گلگت سکاؤٹس نے مہاراجہ کے گورنر کے محل کو گھیرے میں لے لیا تھا اور دوسرے دن گورنر کو حراست میں لے لیا تھا اور مجاہدین نے وہاں اپنی آزاد حکومت بنالی تھی۔

دیگر دور دراز کے علاقوں میں بھی اسی قسم کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ بدھ مت کے لداخ میں بھی بے چینی کے آثار دیکھنے میں آ رہے تھے۔ شمال میں بلتستان کے دارالخلافہ سکردو میں بھی باغی گروہ نصرت اللہ کھڑے ہو رہے تھے بلکہ زوجیلا اور برزل کے دروں کی طرف پیش قدمی کر کے سرینگر وادی کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔

باغ کے مغربی علاقے میں ریاست کی فوج (گیریژن) کو مجاہدین مکمل طور پر ختم کر چکے تھے میرپور کا علاقہ جو جنگ آزادی کا مرکز بن گیا تھا، بہت ہی سرگرم تھا۔ اس علاقے نے دوسری جنگ عظیم میں برطانوی ہندی فوج کو اسی ہزار مسلمان سپاہی دیے تھے اور اب یہاں سے تحریک آزادی کی سب سے بڑی فورس اٹھی تھی۔ ان کے دوش بدوش لڑنے کے لیے بہت سے قبائلی پٹھان آئے تھے۔ ان میں وزیر اور مسعود کے قبائلی بھی تھے۔ افغانستان کے تاجک اور ہزارہ بھی تھے جن کی تعداد غالباً سب سے زیادہ تھی۔ یہاں وزیر کے قبائلیوں نے ایک بڑا ہی دلیرانہ اور خونریز معرکہ لڑا تھا۔ انہوں نے ایک ہندوستانی بٹالین پر تلواروں سے دھاوا بول دیا تھا اور پوری کی پوری بٹالین کا صفایا کر دیا تھا۔ باغ کے علاقے میں دشمن کی تمام چوکیاں صاف کر دی گئی تھیں۔ مینڈھر، کوٹلی اور راجوری جیسے اہم مقامات اب آزاد کشمیر کے مجاہدین کے قبضے میں تھے۔

جنگ جاری رکھنا محال ہو گیا

اس دوران ہندوستان کی مزید فوج کشمیر پہنچتی رہی۔ سرینگر میں یہ فوج بریگیڈ سے بڑھ کر ڈویژن ہو گئی تھی۔ جموں سے ایک بریگیڈ مغرب کی سمت نوشہرہ اور میرپور جانے والی سڑک کے ساتھ چل پڑا تھا۔ اور یہ صاف ظاہر تھا کہ ہندوستان کشمیر میں اپنی فوج بڑھاتا جائے گا۔ ہمیں اس اضافے کو روکنا اور اس کا سدباب کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ آزاد کشمیر کے جو مجاہدین بکھرے پڑے تھے انہیں فوراً ایک مرکز کے تحت لایا جائے اور آپس کا رابطہ قائم ہو جائے تاکہ ہندوستان اس وسیع تحریک کو دبا نہ سکے۔ پہلا اقدام یہ سوچا گیا کہ کم از کم تین مہینوں کے لیے مسلح جدوجہد جاری رکھی جا سکے۔ ہمیں توقع تھی کہ اس طرح اقوام عالم کی توجہ کشمیر کے مسئلے کی طرف ہو جائے گی اور یہ ہو سکتا ہے کہ اقوام متحدہ مداخلت کرے۔

مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ تین مہینوں تک جنگ آزادی جاری رکھنے کے لیے ایمونیشن نہیں تھا۔ کشمیر میں ہندوستانی فوج کی نفری دس ہزار تک پہنچ چکی تھی اور توقع تھی کہ یہ جلدی ہی تیس سے چالیس ہزار تک پہنچ جائے گی۔ اس قوت کا سدباب کرنے اور جنگ آزادی کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں دس ہزار مسلح افراد کی ضرورت تھی۔ افرادی قوت کی کمی نہیں تھی۔ کمی رائفلوں کی اور ایمونیشن کی تھی۔ ہر فرد کو ملا کر زیادہ سے زیادہ دس ہزار افراد ہو جاتے تھے۔ اگر ہر فرد ایک ماہ میں صرف ایک سو راؤنڈ فائر کرے تو تین مہینوں میں تیس لاکھ راؤنڈ فائر ہوتے تھے۔ ایمونیشن کی پوزیشن یہ تھی کہ ہمارے پاس کل دو لاکھ راؤنڈ تھے۔ چنانچہ ہمیں اپنی جنگ کی پلاننگ اس طرح کرنی تھی کہ کھلی جنگ کی بجائے گوریلا آپریشن اور گھات کا طریقہ استعمال کیا جائے۔

ایمونیشن کے سلسلے میں قبائلی پٹھانوں پر سنگین الزامات عائد کیے گئے۔ ایک یہ تھا کہ وہ بہت سارا ایمونیشن کشمیر سے قبائلی علاقے میں لے گئے ہیں۔ اس الزام میں یقیناً حقیقت تھی مگر ہمارے پاس کوئی ایسے ذرائع نہیں تھے کہ ایمونیشن باہر جانے سے روکا جا سکتا۔ الزام تھا تو سنگین لیکن غور کیا جائے تو اس کی نوعیت معمولی رہ جاتی تھی۔ قبائلیوں کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی نہ ان کا کوئی اور ذریعہ آمدنی تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ کشمیر کا مال غنیمت بھیجتے تھے یا یہ ایمونیشن تھا جو انہیں دیا جاتا تھا۔ اس ایمونیشن کا کچھ نہ کچھ حصہ تو وہ دشمن پر فائر کرتے تھے اور اسی حصے سے وہ تسلی بخش نتائج حاصل کر لیتے تھے۔ میرا مشاہدہ یہ تھا کہ

ایمونیشن کی جو مقدار قبائلیوں کو دی جاتی تھی، اگر اتنی ہی فوج کے سپاہیوں کو دی جاتے تو قبائلی تھوڑی سی مقدار فائر کر کے وہ نتائج حاصل کر لیتے تھے جو باقاعدہ تربیت یافتہ سپاہی پوری مقدار فائر کر کے بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

فوجی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بات یوں بنتی ہے کہ اگر فوج کا ایک سپاہی ایک سو راؤنڈ فائر کرے اور دشمن کے ایک سپاہی کو مار دے تو اسے اچھا نتیجہ کہا جاتا ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں دشمن کے ایک سپاہی کو مارنے کے لیے ایک سو نہیں بلکہ کئی سو راؤنڈ فائر کیے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے میں قبائلی اتنی قریب جا کر اور ایسی احتیاط سے فائر کرتا ہے کہ دشمن کو مارنے کے لیے اسے کوئی راؤنڈ ضائع نہیں کرنا پڑتا۔ اس کامیابی کے بعد اگر وہ ایک سو راؤنڈ کا کچھ حصہ اڑا لے جائے تو یہ کوئی نقصان والا سودا نہیں تھا۔ چنانچہ جب میں نے کشمیر میں اعداد و شمار فراہم کیے تو میرے مشاہدے بالکل صحیح ثابت ہوئے۔ پانچ سو قبائلیوں اور پانچ سو فوجیوں نے تین ماہ میں ایمونیشن کی یکساں مقدار فائر کی اور دونوں کے نتائج میں کوئی فرق نہ تھا۔

ایمونیشن کے علاوہ ہماری ایک معذوری اور بھی تھی جو ہمیں قبول کرنی پڑی۔ وہ یہ کہ آزاد کشمیر کے جو عناصر لڑ رہے تھے وہ ایک دوسرے سے رابطے کے لحاظ سے کٹے ہوئے تھے۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ انہیں ایک اجتماعی سٹریٹیجی کے تحت لڑایا جا سکتا۔ اگر ایسا کوئی پلان تیار کیا بھی جاتا تو اس کے ذرائع اور افراد کی باقاعدہ نقل و حرکت کی ضرورت تھی مگر ایمونیشن، اسلحہ، راشن وغیرہ کا کوئی مرکزی ذخیرہ نہ تھا جہاں سے وہ مختلف محاذوں کو بھیجا جاتا اور نہ ہی افراد کا کوئی مرکز تھا جہاں سے انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی ہدایات اور احکام دیے جا سکتے۔ وہ اپنے علاقوں میں اپنے گھروں اور گاؤں کے دفاع میں لڑ رہے تھے اور وہیں سے خوراک حاصل کر لیتے تھے۔ للذا ہر علاقے کی نفری اور صورت حال مختلف تھی اور روز بروز بدلتی جا رہی تھی۔ ایسی صورت حال میں ممکن نہیں تھا کہ ایک جگہ کا دفاع مضبوط کرنے کے لیے کسی دوسری جگہ سے نفری نکال کر اسے کمزور کیا جاتا۔

متحرک لڑنے والا عنصر صرف قبائلی تھے مگر انہیں بھی تھوڑے سے وقت کے لیے ہی جگہ جگہ منتقل کر کے متحرک رکھا جا سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے طور پر اپنے مخصوص طریقہ کار کے تحت دشمن کے علاقے میں دور اندر چلے جاتے تھے جہاں وہ دشمن کو زیادہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔

دسواں باب

کشمیر کا موسم سرما —

محاذ کا جمود

۳۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کے روز مجھے راولپنڈی میں وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کے لیے بلا لیا گیا۔ ملاقات برکت ہاؤس میں ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اپنے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو اعتماد میں لے لیا گیا ہے۔ وہ میری اور وزیر اعظم کی اس کانفرنس میں شامل نہ ہوا، البتہ ساتھ والے کمرے میں موجود رہا۔ وہاں سے اس کے قریب سکندر مرزا (سابق صدر پاکستان) کے ہاتھ مجھے چٹ بھیجی، میں جب سے باہر جا رہا تو اس نے مجھے ایک رقعہ دیا۔ جب میں نے اسے کچھ برا فروختہ کیا تھا۔ یہ تحریر کے دوران کی بات ہے کہ کشمیر میں ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ ایک روز جنرل گریسی جی ایچ کیو کے افسروں سے خطاب کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں ہندوستان سے جنگ مول لینے سے ڈرایا تھا اور کہا تھا کہ اس کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان پاکستان کو دس دن میں تہ تیغ کر دے گا۔

مجھے طیش آ گیا۔ افسروں کے اس اجتماع میں ہندوستانی فوج کے بھی دو افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کاغذ پر یہ احتجاجی الفاظ لکھ کر جنرل گریسی کے آگے رکھ دیے کہ اس نے ہندوستانی افسروں کی موجودگی میں ایسے الفاظ کہے ہیں جو انہیں خواہ مخواہ کا حوصلہ اور جوش دے سکتے ہیں۔ فوجی اور جنگی ساز و سامان کی افرادی قوت بھی کم ہو سکتی ہے لیکن جنگ تو انہی دو عناصر کے بل بوتے پر نہیں جیتی جا سکتی۔ جذبہ اور عزم کو تو بھی کچھ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ میں پورے وثوق اور قطعیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہندوستانیوں نے کبھی ہماری سرزمین پر قدم رکھا تو ہم صرف لاٹھیوں سے ہی انہیں مار بھگائیں گے۔

میری تحریر پڑھ کر اس نے بعد میں مجھے بلایا اور کہا کہ وہ پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف کا عہدہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا بلکہ اس نے یہ عہدہ ٹھکرا بھی دیا تھا لیکن قائد اعظم کے اصرار پر اس نے صرف چھ ماہ کے لیے یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ اس نے ہندوستانی فوجوں کی موجودگی میں ایسی بات کی لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ صرف وظیفوں سے جنگ نہیں لڑی جا سکتی۔

۲۰ دسمبر کے روز وزیر اعظم کی کانفرنس کے بعد جب میں جنرل گریسی سے ملا تو اس نے کہا "اب آپ کو وظیفوں سے نہیں لڑنا پڑے گا میں آپ کی مدد کر رہا ہوں" — اس نے مجھے کشمیر میں استعمال کرنے کے لیے اس لاکھ راؤنڈ ایمونیشن کی منظوری دے دی۔ یہ تعداد ایک مہینے کے لیے کافی تھی۔ اس نے مجھے پاکستان آرمی سے باوردی رضاکار افسر تین ہفتوں کے لیے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی یعنی ایسے افسر جو رضاکارانہ طور پر ساتھ جائیں۔

اگلے تین ہفتوں کے دوران، دسمبر کے آخر میں ہندوستان نے محسوس کیا کہ وہ کشمیر کی جنگ فوجی طاقت سے نہیں جیت سکتا چنانچہ وہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں لے گیا۔ اس نے اقوام متحدہ سے یہ درخواست نہیں کی کہ وہ کشمیری عوام کو حق خود ارادیت دے کر ان کی خواہشات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینا چاہتا ہے اس لیے اقوام متحدہ مداخلت کرے بلکہ اس نے اقوام متحدہ سے یہ کہا کہ جو کام وہ خود نہیں کر سکا وہ اقوام متحدہ کرے۔ پہلے تو وہ یہ چاہتا تھا کہ پاکستان "حملہ آوروں" کو مدد دینے سے گریز کرے۔ پھر اس نے حملہ آوروں کو کشمیر سے نکالنے کی کوشش کی اور اب وہ یہ دونوں کام اقوام متحدہ سے کروانا چاہتا تھا۔

ایک ہندوستانی دستاویز کے مطابق ہندوستان نے یہ فیصلہ کیا تھا — "کشمیر کا تنازعہ اس جائز امید کے ساتھ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کے سامنے رکھا جائے کہ پاکستان کو کشمیر میں جارحیت ختم کرنے پر مجبور کرنے کے لیے اس پر عالمی رائے عامہ کا دباؤ ڈالا جائے گا۔"

KASHMIR FACTUAL SURVEY 1956

ہندوستان کا منشا یہ نہیں تھا کہ اصل مسئلے کی طرف توجہ دی جائے یا غیر جانبدارانہ طریقے سے عوام کی رائے لی جائے بلکہ ہندوستان یہ چاہتا تھا کہ پاکستان کو عالمی عدالت میں ملزم بنا کے "مجرم" کی سزا دے۔ برطانوی وفد کے ایک رکن نے ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ کے روز سیکورٹی کونسل میں بحث کا آغاز کرتے ہوئے صحیح جواب پیش کیا تھا۔ سیکورٹی کونسل کی دستاویز کے مطابق اس نے

کہا تھا — میرے خیال میں جنگ ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان فریقوں کو جو لڑ رہے ہیں یہ یقین دلا دیا جائے کہ ایسا سمجھوتہ کیا جائے گا جس کے تحت ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ فریقین کو ان کے مستقبل کے متعلق یقین دلا دیا جائے تو وہ جنگ بند کر دیں گے۔

لہٰذا سیکورٹی کونسل ہندوستان کی خواہش کے مطابق اس کی مدد کو دوڑی ہوئی نہ پہنچی جس کے نتیجے میں جنگِ آزادی جاری رہی لیکن اب میدانِ جنگ جموں کے جنوب میں تھا۔ ہندوستانیوں نے اس علاقے میں خاصی زیادہ نفری اور طاقت سے پیش قدمی کی اور آزاد کشمیر کے مجاہدین اور قبائلی پٹھانوں نے ان کا خوب مقابلہ کیا۔ کئی ایک مقامات پر شدید معرکے لڑے گئے۔ ایک ہندوستانی بریگیڈ تو پٹ گیا۔ بہت سا جنگی ساز و سامان آزاد کشمیر کے مجاہدوں اور پٹھانوں کے ہاتھ لگا جس میں چند ایک بکتر بند گاڑیاں بھی تھیں۔ تاہم ہندوستانی سڑک پر قابض رہے۔ آہستہ آہستہ جمود طاری ہو گیا۔ یہ جلدی ہی واضح ہو گیا کہ سردیوں میں کوئی فیصلہ کن جنگی اقدام نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہمیں موسم بہار کے لیے تیاری کرنی ہوگی۔

آزاد کشمیر کا جی ایچ کیو اور برٹش کمیٹی

اس مقصد کے لیے برٹش کمیٹی اور آزاد کشمیر کے جی ایچ کیو نے ساز و سامان اور وسائل کا انتظام اور سیکٹروں کو منظم کرنے کا کام شروع کر دیا۔ آنے والے دنوں میں جو کچھ ہوا اور جس قدر مقصد حل ہوا اس کا سہرا آزاد کشمیر کے مختلف سیکٹروں کے مجاہدین کے سر ہے جنہوں نے کسی مدد کے بغیر سارا بوجھ سنبھالا۔ اس کے ساتھ ہی برٹش کمیٹی اور آزاد کشمیر کا جی ایچ کیو بھی داد کا مستحق ہے۔ ان دونوں اداروں نے ہی سارا انتظام کیا تھا۔ ان دونوں کی کوششوں کے بغیر پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام سے مدد و امداد کا بہتر بندوبست نہ ہو سکتا مگر یہ دونوں ادارے احوال و کوائف کی وجہ سے ایسے محدود اور مضطرب تھے کہ جتنے بڑے ان کے کام تھے اتنے زیادہ اہتمام کے وہ قابل نہ تھے۔

برٹش کمیٹی بتدریج سیاسی قسم کی رابطہ کمیٹی بن گئی۔ یہ اس کے مقاصد میں شامل نہیں تھا یہ زیادہ تر طریقہ کار، انتظامی امور اور سیاست میں الجھتی چلی گئی۔ اس کا صدر جسٹس دین محمد تھا۔ ریٹائرڈ جج ہونے کی وجہ سے کمیٹی کے اجلاس کا انداز عدالتی اجلاسوں کا سا ہوتا چلا گیا۔ عام طور

کی رپورٹیں اور بیانات الزامات کی شکل اختیار کرتے گئے اور الزامات صرف اس لیے صحیح
قرار دیے جاتے رہے کہ ان کے خلاف جرح کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگی
کارروائیوں اور سرگرمیوں میں جان ڈالنے کی بجائے متعلقہ افراد ان الزامات کے خلاف اپنے
دفاع میں مصروف ہوتے گئے بجائے اس کے کہ فوج، وسائل اور اصل ضروریات کی جو صورت حال
ہوتی، غیر ذمہ داری کے مظاہرے ہونے لگے۔ برٹش کیبنٹ کا ممبر بے شک بااقتدار اور قانون کا
پابند تھا۔ اس کے متعلق کمیٹی کے ایک رکن نے یہ رائے دی تھی — وہ اجلاس کی صدارت
ایسے آئینی جج کی حیثیت سے کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کسی غیر قانونی کیس کی سماعت
کر رہا ہو؟

آزاد کشمیر کے دو فیلڈ مارشل

آزاد کشمیر کے جی ایچ کیو پر تو جنگ کی تمام تر ذمہ داریوں کا بوجھ براہ راست پڑ رہا تھا۔ وہاں
بھی متعدد قسم کے حکام اور نظام سے واسطہ پڑتا تھا۔ سٹاف کافی نہیں تھا۔ ریکارڈ اور مواصلاتی
نظام بھی ناپید تھا۔ لہٰذا فطری امر کے باوجود اس جی ایچ کیو کی کوششیں بار آور نہیں ہوتی تھیں۔
جی ایچ کیو (آزاد) کے سربراہ ایک وزیر دفاع بھی تھا جو کشمیر کی ریاستی فوج کا ریٹائرڈ اور
معزز افسر تھا۔ وہ اس نظام کی بے قاعدگی کی وجہ سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ برطانوی افواج
کے قواعد و ضوابط کی ایک کاپی — برٹش فیلڈ سروس ریگولیشنز — اٹھائے اٹھائے پھرتا
تھا اور پریشان تھا کہ جی ایچ کیو کو مختلف برانچوں میں کیوں منظم نہیں کیا جاتا۔ مثلاً جنرل سٹاف،
ایڈجوٹنٹ جنرل اور کوارٹر ماسٹر جنرل وغیرہ۔ مگر وہاں کچھ افراد جمع کر لیے گئے تھے جن میں بڑے
عہدے کا کوئی افسر نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ میجر تھے اور وہ بھی ایسے جو جنگ عظیم کے دوران
ویلفیئر آفیسر رہے تھے۔ لہٰذا بہتر تنظیم کا قیام ممکن ہی نہیں تھا۔

جی ایچ کیو (آزاد) کے پیچھے ہر محاذ کے کمانڈروں اور لیڈروں کا ایک ہجوم سا ہوتا چلا جاتا
تھا جو کہ وہ سب رضاکار تھے۔ اس لیے وہ اپنے لیے جو عہدہ منتخب کرتے تھے وہ جی ایچ کیو کو
ان کی خوشنودی یا فوری جنبش کے لیے قبول کرنا پڑتا تھا — یہ کچھ کے علاوہ ایسے کمانڈروں کے
اپنے اپنے ہیڈ کوارٹر بنا لیے تھے اور وہ اپنی جی ایچ کیو (آزاد) کو محاذ کی رپورٹیں الگ الگ بھیجتے تھے

ان میں ایک اپنے دستخطوں کے ساتھ کیپٹن لکھتا تھا اور دوسرا میجر۔ پھر دونوں نے اپنے آپ کو ترقی دے لی۔ کیپٹن میجر بن گیا اور میجر کرنل۔ ان میں ہر ایک اپنے آپ کو اس محاذ کا کمانڈر سمجھتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے اپنے آپ کو مزید ترقی دے لی۔ میجر کرنل بن گیا تو دوسرے نے اپنے آپ کو کرنل سے بریگیڈیئر بنا لیا۔ کرتے کرتے دونوں فیلڈ مارشل بن گئے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ آزاد کشمیر کے وزیرِ دفاع نے اپنے نام کے ساتھ جرمنی کی فوج کا عہدہ کیپٹن جنرل لکھنا شروع کر دیا کیونکہ دو فیلڈ مارشلوں کے بعد اس کے لیے کوئی عہدہ نہیں رہ گیا تھا۔

آزاد کشمیر کا جی ایچ کیو دو فیلڈ مارشلوں اور ایک کیپٹن جنرل کے درمیان پھنس گیا۔ اس نے نہایت چابکدستی اور دانشمندی سے ان کے درمیان سے راستہ بنایا اور پہلو بچا کر نکل گیا۔ اس کے علاوہ جی ایچ کیو (آزاد) جنگ جیتنے کے ذرائع اور نت نئے طریقے سوچنے کے لیے بھی وقت نکالتا رہا اور اسے باہر سے طرح طرح کے مشورے ملتے رہے۔ ان میں ایک ہوائی حملے کے متعلق ایک مشورے نے خصوصی توجہ حاصل کی۔

یہ مشورہ ایئر فورس کے ایک سابق وارنٹ آفیسر نے بھیجا تھا لیکن مشورہ بھیجنے سے پہلے اس نے بہت سی خط و کتابت کی تھی اور یہ تاثر دیا تھا کہ وہ ایک بے حد خفیہ قسم کا اور ناکام نہ ہونے والا مشورہ دینا چاہتا ہے۔ اسے جب یقین دلایا گیا کہ اس کا مشورہ ایک فوجی راز کی طرح صیغۂ راز میں رکھا جائے گا تو اس نے ٹائپ کی ہوئی سکیم کی پوری فائل بھیج دی۔ اس کے ساتھ کچھ نقشے (بلیو پرنٹ) بھی تھے۔ یہ سکیم پڑھی گئی تو انکشاف ہوا کہ اس وارنٹ آفیسر کے پیشِ نظر صرف کشمیر نہیں بلکہ اس نے تمام تر ہندوستان کو فتح کرنے کی سکیم پیش کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ فوج گلائیڈروں سے دشمن کے علاقے میں اتاری جائے ـــــ یہ پلان یقیناً کامیاب ہوتا بشرطیکہ ہمارے پاس دو ہزار گلائیڈر ہوتے۔

ایک مشورہ ہندوستان کے ایک مہاجر نے بھی پیش کیا تھا۔ اسے پورا پورا اعتماد تھا کہ وہ دور مار راکٹ بنا سکتا ہے۔ اس نے لکھا کہ اس نے جرمنوں کے اس علم کا مطالعہ کیا ہے اور اس علم میں اس نے اپنی ایک ایجاد کا اضافہ کیا ہے۔ اسے ایک ورکشاپ کی ضرورت تھی جہاں وہ راکٹ بنا کر دکھانا چاہتا تھا۔ اسے پاگل تک کہا گیا اور پھر جانے اس کے کیا کیا نام دھرے گئے مگر وہ عزم کا پکا ثابت ہوا۔ آخر اسے وہ سہولتیں دی گئیں جو اس نے مانگی تھیں۔ اس نے کام شروع

قریباً چھ ہفتوں کے بعد اس نے جو کچھ بنا کر دکھایا وہ رائفل کی گولی کی شکل کی بیس فٹ لمبی ایک لکڑی تھی جس پر اس نے سبز رنگ کیا تھا اور نیچے والے حصے پر سفید چاند تارا پینٹ کیا تھا۔

آزاد کشمیر میں بے ایمانی شروع ہوگئی

اس دوران پونچھ کے ارد گرد سردی شروع ہوگئی۔ یہ شہر نومبر ۱۹۴۷ء کے وسط سے کشمیر سے کاٹ دیا گیا تھا۔ یہ مسلسل محاصرے میں تھا۔ شہر کے اندر جو ہندوستانی فوج تھی اس کا کمانڈر بریگیڈیئر پریتم سنگھ تھا۔ اس کے دستوں اور اندر کی شہری آبادی کو صرف باہر سے سپلائی مل سکتی تھی مگر ہم نے نومبر کے مہینے سے اوڑی پونچھ روڈ کو بند کر رکھا تھا۔ دوسرا راستہ فوجوں کا راستہ استعمال ذریعہ تھا جو گلمرگ کی پہاڑیوں سے وادی کی طرف سے آتا تھا لیکن برفباری اتنی زیادہ تھی کہ یہ راستہ بھی بند تھا۔

تمام راستے بند ہوجانے کی وجہ سے ہندوستان کا انحصار اب صرف طیاروں پر تھا۔ وہاں جو تھوڑے سے ڈکوٹا طیارے اترتے تھے وہ بہت تھوڑا اور نہایت ہی اہم ضرورت کا سامان لاتے تھے لیکن ہم نے چند [illegible] کو فائر کی زد میں لے کر ہندوستانی طیاروں کی آمد و رفت بھی بند کر دی۔ چند ہی دنوں کے اندر پونچھ کے اندر دشمن کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی مگر ایک غیر معمولی واقعہ ہوگیا — سیکٹر کمانڈر کرنل صادق نعمان کو پونچھ سیکٹر میں عارضی فائر بندی کا حکم مل گیا کیونکہ دشمن کی درخواست پر اسے مہلت دی گئی تھی کہ وہ بیمار اور زخمی لوگوں کو پونچھ سے باہر نکال سکے مگر اس درخواست کا بھانڈا [illegible] دے کر ہندوستانیوں نے ہمارے آدمیوں کی نظروں کے سامنے پونچھ کے اندر ایک بیس بنیادی اور ارد گرد کی پہاڑیوں پر مورچہ بندی کر لی تاکہ طیاروں کی آمد و رفت کو محفوظ کیا جا سکے۔

موسم سرما امن و امان سے گزر گیا مگر ہر ایک مقام پر امن یا جمود نہیں تھا۔ ادھر آزاد کشمیر کی انتظامیہ میں بدعنوانیاں شروع ہوگئیں۔ راولپنڈی سے جو سامان اور راشن آتا تھا وہ محاذوں تک اکثر پہنچتا ہی نہیں تھا۔ کپڑے، کمبل اور دوسری اشیاء جو پاکستان بھر کے لوگ دل کھول کر دیتے تھے وہ پنڈی کے بازاروں میں کھلے بندوں بکتی جا رہی تھیں۔ افسروں اور لیڈروں کو بڑی مشکل سے آمادہ کر کے آزاد کرائے ہوئے علاقوں کے دورے پر بھیجا جاتا تھا تاکہ وہاں

کے انتظامی مسائل کو دیکھیں اور پھر ازیں گروہ عارضی طور پر کی پرائیویٹ تجارت اور دیگر
ذرائع آمدنی میں مگن ہو جاتے تھے۔

میرے اپنے ماتحت حکام بھی سرگرم تھے سب سے پہلے تو انھوں نے مدد اور تعاون
سے ہاتھ کھینچ لیا، وہ ایسا کر سکتے تھے کیونکہ مدد دینے کے انہیں کوئی احکام نہیں ملے تھے۔

پھر پاکستان آرمی کے ان افسروں کی مخالفت شروع ہو گئی جو رضاکارانہ طور پر کشمیر کی جنگ میں شریک
ہوتے تھے۔ اس کے فوراً بعد میری ذات کے خلاف ایک باقاعدہ مہم شروع ہو گئی پہلے تو مجھے اس
کا پتہ ہی نہ چلا کیونکہ میری تمام تر توجہ محاذ پر مرکوز تھی۔ ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ مجھے تین ماہ کی
"کمانڈ تنخواہ" سے محروم کر دیا گیا ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ میں چھٹی لیے بغیر نوکری سے غیر حاضر ہوں۔

میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ سوچا کہ یہ تو غیر اہم سا معاملہ ہے فارغ ہو کر طے کرا لوں گا
مگر اکتفا اسی پر نہ کی گئی۔ میں واپس نہ گیا تو مجھے پتہ چلا کہ جرنیلوں کے ایک انتخابی بورڈ نے فیصلہ
کیا ہے کہ مجھے ترقی سے محروم رکھے جانے کے باوجود جونیئر افسروں کو ترقی دی جائے۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جسے
میں نظرانداز نہ کر سکا۔ یہ فیصلہ اس قدر بے بنیاد اور بے جواز تھا کہ میرے احتجاج کے چوبیس گھنٹوں
کے اندر واپس لے لیا گیا مگر میرے خلاف جو مہم شروع ہوئی تھی وہ ختم نہ ہوئی۔ میں اس وقت
اندازہ ہی نہ کر سکا کہ میرے خلاف جو سازش شروع ہوئی ہے وہ کتنی گہرائی تک پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے بہرحال یہ ضرور محسوس کیا کہ محاذ پر مجھے جس تعاون اور امداد کی ضرورت تھی وہ
مجھے نہیں مل رہی تھی۔ لاہور میں وزیراعظم لیاقت علی خان کے ساتھ میری جو کانفرنس ہوئی
تھی اس میں مجھے یہ کام سونپا گیا تھا کہ تین ماہ تک کشمیر میں جنگ جاری رکھوں۔ اب یہ مدت
گزر گئی تھی، میں اپنا فرض پورا کر چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے پاکستان آرمی میں واپس چلے
جانا چاہیے۔ محاذ کے کسی بھی حصے میں کوئی نمایاں یا قابل ذکر خطرہ نہیں تھا۔ اوڑی سیکٹر برف
تلے دبا ہوا تھا اور باقی ہر مقام پر جمود طاری تھا۔ کشمیر پر ہمارا جو حق اور دعویٰ تھا، اس کی
حمایت میں عالمی رائے بھی حاصل ہو گئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اقوام متحدہ اپنا کوئی فیصلہ
جلد صادر کرے گی۔

ان احوال و واقعات کے پیش نظر میں نے فروری ۱۹۴۹ میں حکام بالا سے درخواست
کی کہ مجھے کشمیر محاذ سے فارغ کیا جائے۔ چند دن بعد وزیراعظم نے ایک ملاقات میں میری درخواست

حل کی۔ حکومت پاکستان اس امر پر غور کر رہی تھی کہ یہ کام فوج کے سپرد کیا جائے۔ اس دوران میری اطلاع پر شملہ کیمپ میں میرے جو واقف تھے وہ بریگیڈیئر شیر خان اور شمس تھے۔

گیارھواں باب

ہندوستانیوں کا موسمِ گرما کا حملہ

اپریل ۱۹۴۸ء کے وسط میں یوں نظر آنے لگا جیسے کشمیر میں ہندوستانی دستے بڑے پیمانے پر حملہ کریں گے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ گذشتہ کئی ہفتوں کے دوران ہندوستانی فوج میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم نے دشمن کے جو پیغامات سنے اور جو ہمارے مخبروں نے خبریں دی تھیں اور ہندوستانی پروپیگنڈے کا جو لب و لہجہ تھا ان سب سے صاف پتہ چلتا تھا کہ بہت بڑے واقعات ظہور پذیر ہونے والے ہیں۔

سیکورٹی کونسل نے ہندوستان اور پاکستان سے کہا تھا کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ زیر غور ہے صورت حال کو بگاڑنے سے گریز کریں لیکن اس سے ہندوستانی لیڈروں کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ان کا سرکاری اعلان یہ تھا کہ وہ کشمیر میں صرف بغاوت کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ کشمیر میں غیر جانبدارانہ رائے شماری کرائیں گے خواہ کشمیر پاکستان کو ہی کیوں نہ مل جائے مگر اب غیر جانبدارانہ رائے شماری کی بھی انہیں کوئی خواہش نہیں تھی نہ وہ پاکستان کو کشمیر میں شکست بے جا سے دوچار کرنا چاہتے تھے بلکہ اب وہ کشمیر کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لینا چاہتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اپنی اسمبلی میں اپنے عزائم کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا — ہمیں الحاق کے متعلق ریاست کشمیر کے فیصلے کے ساتھ بڑی ہی گہری دلچسپی تھی۔ کشمیر کی سرحدیں روس، چین، پاکستان اور افغانستان سے ملتی ہیں۔ اس کی اس جغرافیائی پوزیشن کا تعلق براہ راست ہمارے تحفظ اور عالمی رابطے سے ہے:

مسٹر نہرو کے الفاظ سے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کو کشمیریوں

کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ وسطی ایشیا کے سیاسی نقشے پر اپنی اہمیت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ سرگرمیاں نئے دور میں بھی تھا ـــ کشمیر کے بغیر ہندوستان وسطی ایشیا کے سیاسی نقشے پر مرکزی پوزیشن حاصل نہیں کر سکے گا۔ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کے تحفظ کے لیے کشمیر بہت ہی ضروری ہے۔ تاریخ کی ابتدا سے یہی پوزیشن چلی آ رہی ہے۔ کشمیر کے شمالی علاقے ہیں پاکستان کے صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب میں داخل ہونے کے لیے دروازے مہیا کرتے ہیں۔ یہ شمال میں روس کی طرف کھلنے والی ہندوستان کی واحد کھڑکی ہے۔ یہ کھڑکی مشرق میں چین کی طرف اور مغرب میں افغانستان کی طرف بھی کھلتی ہے۔"

ان عزائم اور توقعات کے پیش نظر ہندوستان نے حملے کی تیاریاں شروع کی تھیں۔ ان سے ایسا خطرہ پیدا ہو گیا تھا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پاک فوج کشمیر میں داخل ہوئی

۲۰ اپریل ۱۹۴۸ء کے روز پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے ان الفاظ میں حکومت پاکستان کو رپورٹ پیش کی تھی ــــ "ہندوستانی فوج کو جو آسان فتح، خصوصاً مظفرآباد کے علاقے میں ہوئی ہے۔ اس سے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ قبائلی پاکستان سے براہ راست مدد نہ ملنے کی وجہ سے ناراض ہوں گے اور پاکستان کے خلاف بھی اٹھ سکتے ہیں ـــ اس نے سفارش کی ـــ اگر پاکستان چاہتا ہے کہ اسے کشمیر سے بے گھر ہونے والے لاکھوں مہاجرین کا سامنا نہ ہو اور اگر پاکستان چاہتا ہے کہ ہندوستان کو اپنے دروازے پر عقب میں اور پہلو میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ شہری اور فوجی مورال خطرناک حد تک متاثر نہ ہو اور اگر پاکستان چاہتا ہے کہ تخریب کار سیاسی قوتوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور وہ پاکستان پر ٹوٹ پڑیں تو یہ لازمی ہے کہ ہندوستانی فوج کو اوڑی، پونچھ، نوشہرہ کی لائن سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے"

(سیکیورٹی کونسل / ایس پی وی - ۸، فروری ۱۹۵۰ء)

چند دن بعد حکومت پاکستان نے دفاعی تدبیر کے طور پر کشمیر میں پاک آرمی کے کچھ دستے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان دستوں کو اس قسم کی ہدایت دی گئی تھی کہ وہ آخری لمحے تک کوشش کریں کہ ہندوستانی فوج کے ساتھ براہ راست تصادم نہ ہو۔ آزاد کشمیر کی فوج کے عقب میں رہیں اور اگر ہندوستانی

پاکستان کی سرحد پر معمولی توڑ سے رہیں — کشمیر میں اپنے فوجی دستے گئے تو تمام تر کمان پاکستانی آرمی کے جی ایچ کیو کے ہاتھ میں تھی۔ میں اس وقت چھٹی پر تھا۔ اس کے بعد مجھے کسی دستے کے ساتھ محدود سے سیکٹر کا چارج لینا تھا۔

اپریل کے آخر میں میں اپنے بریگیڈ کے ساتھ شمال مغربی سرحدی صوبے میں کوہاٹ چھاؤنی میں تھا۔ وہاں سے ہمیں راولپنڈی پہنچنے کا حکم ملا۔ راولپنڈی سے اسی کے روز ڈویژن کمانڈر نے میرے بریگیڈ کے حصوں کو کشمیر کے چند ایک مقامات پر بھیج دیا۔ یہ پوزیشنیں نقشے پر ملاحظہ فرمائیے۔

نقشہ اگلے صفحے پر دیکھئے

ہندوستانی فوج کی نقل و حرکت کا بیس ابھی سرینگر ہی تھا۔ ان کے دستوں کی مختلف ہیڈکوارٹروں کی پوزیشنوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا حملہ مظفرآباد کی سمت میرے سیکٹر پر بارہ مولا اوڑی روڈ کی طرف سے آئے گا۔

اس بڑے اور مرکزی محاذ پر اوڑی کے سامنے ۱۷ مئی ۱۹۴۸ء کے روز میری کمان کے اندر کل ہماری نفری یہ تھی — ایک بٹالین، کچھ فرنٹیئر سکاؤٹس، کچھ قبائلی پٹھان اور آزاد کشمیر کے کچھ دستے —

مقصد کے لیے ہمارے لیے ضروری تھا کہ اپنے آدمیوں کو اپنے دائیں پہلو کی دور دراز پہاڑیوں میں رکھیں۔ اس طرح ہم انہیں سپلائی بھیجنے کے قابل ہو سکیں گے۔ بشرطیکہ دائیں پہلو کی سڑک کو دار سے پانچ میل تک ہمیں مل جاتے۔

یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ اس کے تحت ہمارے سیپرز نے فوراً ہی سڑک پر بھرپور کام شروع کر دیا خچروں کا راستہ پہلے سے موجود تھا۔ اسے تقریباً پچاس میل تک ٹرکوں کی آمد و رفت کے قابل بنانا تھا۔ مقامی لوگوں میں خوب جوش و خروش تھا۔ وہ ہمیں ہر روز بغیر اجرت کے ایک ہزار مزدور دیتے تھے۔ اس کے باوجود کام کی تکمیل کے لیے طویل وقت درکار تھا۔

۱۵ مئی ۱۹۴۸ کے روز میں اس علاقے میں پہنچنے کے چار روز بعد جب کہ بریگیڈ اپنے کام میں مصروف تھا اور دشمن کے حملے سے تین روز پہلے مجھے حکم ملا کہ بریگیڈ کسی اور کے حوالے کر دوں اور ٹیٹوال کے راستے شمالی پہاڑی کے پاس چلا جاؤں۔ میرے پیچھے پیچھے پانچ ہزار قبائلی جوانوں کو آنا تھا اور ہمیں سرحد کی سمت دور اندر تک شب خون مارنے اور حملے کرنے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی توجہ شمال کی طرف موڑ دی جائے تاکہ وہ مظفرآباد کی سمت پیش قدمی نہ کر سکیں۔ یہ سکیم نہایت اچھی تھی بشرطیکہ کچھ عرصہ پہلے اس پر عمل کیا جاتا۔ اس مرحلے پر مجھے یہ قابل عمل نظر نہیں آتی تھی۔ ایسے نازک وقت میں پانچ ہزار قبائلیوں کو سنبھالنا اور انہیں موزوں طریقے سے استعمال کرنا بہت بڑا کام تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے لیے مجھے محاذ کا نہایت اہم اور نازک حصہ چھوڑنا پڑے گا کیونکہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مجھے اکیلے ہی پہلو کی طرف جانا تھا جہاں مجھے ملنے والوں کے لیے انتظار میں بیکار بیٹھنا تھا۔ پانچ ہزار قبائلی ابھی آئے ہی نہیں تھے۔

قبائلیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے دو ہفتے وقت درکار تھا۔ مظفرآباد سے ٹیٹوال اور اس سے آگے تک پہاڑیوں میں سے چار دنوں کا سفر تھا۔ انہیں چار دنوں کا راشن ساتھ لے جانا تھا جس کے لیے کم و بیش ۸ سو قلیوں کی ضرورت تھی۔ آگے کے لیے مزید دو دنوں کی سپلائی بھی ضروری تھی جس کے لیے مزید چار سو قلیوں کی ضرورت تھی۔ ان سب کو قلیوں کے ساتھ جانا تھا۔ روزمرہ سپلائی کو رواں رکھنے کے لیے چار اسٹیشنوں یعنی ڈپوؤں کی ضرورت تھی۔ ہر اسٹیشن میں دو سو آدمی درکار تھے۔ قلیوں کی اس نفری میں اگر ہم ریزرو ایمونیشن، بستر، میڈیکل سامان وغیرہ اٹھانے کے لیے دو سو قلیوں کا اضافہ کریں تو اس طرح ہمیں دو ہزار دو سو قلیوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے تجربے کی بنا پر سوچا کہ عجلت میں قلیوں کی اتنی نفری حاصل کرنا ممکن نہیں

مظفرآباد سے بھاگ رہے تھے۔ چلو کھی والی سڑک پر پناہ گزینوں کے قافلے چلے آ رہے تھے۔
ان کے ساتھ بھیڑ بکریاں اور گھریلو سامان تھا۔

میں نے ایک جگہ فرنٹیئر سکاؤٹس کی دو پلاٹونوں کو روکا۔ وہ بھی گلگت سے جا رہے تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے، باقاعدہ تنخواہ لیتے تھے۔ فوجی قانون کے تحت تھے۔ لہٰذا میں نے انہیں حکم دیا کہ محاذ پر واپس چلیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال تھی۔ یہ وہ آدمی تھے جو تربیت یافتہ سپاہی تھے اور جو انگریزوں کی ملازمت میں بہترین جنگجو تسلیم کیے جاتے تھے مگر اب وہ اس درجہ دہشت زدگی سے بدحواس بھاگ رہے تھے اور حکم عدولی کر رہے تھے۔ ایسی بزدلی کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ ان کا کوئی ایک بھی آدمی زخمی تک نہیں ہوا تھا نہ کوئی جانی نقصان ہوا تھا۔ بہرحال کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے قریب ہی قبائلی پٹھان موجود تھے۔ میرے کہنے پر انہوں نے فرنٹیئر سکاؤٹس کے ان جوانوں پر رائفلیں تان لیں اور ان سے ہتھیار رکھوا کر انہیں نہتا کر دیا۔ میں نے ان کے دو افسروں کو حراست میں لے لیا۔ میں نے ان کی لاریوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ میں ان دونوں افسروں کو اپنے ساتھ لے گیا اور ان کے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ وہیں انتظار کریں۔

تھوڑا اور آگے میں نے ایک جیپ روکی۔ اس میں ایک میڈیکل آفیسر بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ جیپ سے باہر آئے اور اپنی یونٹ میں پیدل واپس جائے۔ اس کی یونٹ وہاں سے پندرہ میل دور تھی۔ میں نے اس کا بستر وغیرہ اس کے سر پر اٹھوا دیا اور ایک سپاہی ساتھ کیا جو رائفل سے سنگین لگائے میڈیکل آفیسر کو آگے آگے لگائے اسے یونٹ کی طرف لے گیا۔

میں چلو کھی پہنچا تو دیکھا وہاں بھی سنسان ہوا پڑا ہے۔ بٹالین کمانڈر اور اس کے افسروں اور جوانوں کا مورال مستحکم اور جذبہ قائم تھا لیکن صورت حال امید افزا نہیں تھی۔ ہم نے ذہن میں چلو کھی میں خوب ترتیب سے پاؤں گاڑے تھے اور میں جانتا تھا کہ یہ نہایت اچھی دفاعی پوزیشن ہے۔ اب ہر قیمت پر اس پوزیشن کا دفاع کرنا اور اسے بچانا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میدان جنگ میں ہم اگلی صبح جائیں گے۔

میں اپنی پارٹی کو ذرا پیچھے ایک پہاڑی کے پاس لے گیا اور ایک ایسے گڑھے میں چھپا دیا جس میں سڑک پر نیچے سے محفوظ رہا جا سکتا تھا — جوں ہی صبح کی پہلی روشنی نمودار ہوئی

کا ایک طیارہ مشین گنیں فائر کرتا ہوا گزر گیا۔ میں حیران سا ہو کر سوچنے لگا کہ سارے کشمیر کو چھوڑ کر صرف اس کھنڈر پر طیارے نے کیوں حملہ کیا ہے جس میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں؟ مجھے فوراً جواب مل گیا۔ ہمارے نیچے سپلائی ڈمپ تھا۔ دشمن اسے تباہ کرنا چاہتا تھا۔ کئی طیارے آئے اور حملہ کر کے چلے گئے۔ ایک لاری تباہ ہوگئی اور ڈمپ کے کچھ حصے کو آگ لگ گئی۔

کچھ دور آگے سامنے میں ایک چھت پر کوئی آدمی سفید چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ وہ جنگل کے محکمے کا افسر تھا جو خوف سے پڑا ہوا تھا۔ ایک طیارہ خاص کر جنگلی پرواز کرتے ہوئے اس پر غوطے میں آیا۔ یہ افسر تھا اور چادر کو فائر والوں کی طرح دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر طیارے کو اپنے اوپر آتے دیکھتا رہا جیسے طیارے کو للکار رہا ہو۔ ایک لمحہ بعد اس نے چادر پھینک دی اور چھت سے بروقت کود گیا۔ وہ تو بچ گیا لیکن اس کی جیپ جو کہیں قریب ہی کھڑی تھی، بمبار کی زد میں آگئی اور جل گئی۔

تین سو گز دور دو آدمی نمودار ہوئے۔ ان کی چال ڈھال مشکوک نظر آئی۔ وہ وردی میں تھے دونوں ہمارے سکاؤٹ تھے اور فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے اپنے ایک سٹاف آفیسر کو غصے سے چلاتے ہوئے کہا کہ بھاگ کر انہیں روک لے لیکن سٹاف آفیسر سے پہلے ان دونوں تک دشمن کا طیارہ پہنچ گیا اور اس کے ایک بم نے دونوں کے پرخچے اڑا دیے۔

دشمن کے طیارے اس علاقے پر متواتر اڑتے اور حملے کرتے رہے۔ انہوں نے ہر ایک چیز پر حملے کیے — ٹرکوں پر، جیپوں پر، اکے دکے سپاہیوں اور شہریوں پر — ان ہوائی حملوں کے درمیان پہلے ہی وقفے میں میں چوکی کی طرف چل پڑا۔ میں نے سڑک سے ذرا پرے ایک نشیب میں چند ایک باوردی آدمی دیکھے۔ یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا کہ یہ وہ کمپنی تھی جسے میں نے چھتیس گھنٹے پہلے اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ دریا پار کر کے دوسری طرف دشمن کو روکے۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ انہوں نے دریا پار کر لیا تھا لیکن دیہاتیوں سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ دشمن پہلے ہی وہاں پہنچ چکا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی کمپنی کمانڈر اس کمپنی کو واپس لے آیا تھا اور سڑک کے کنارے اس محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دشمن کو نہیں دیکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ دشمن ابھی وہاں تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ میں نے دور بین سے دریا کے پار دیکھا۔ مجھے وہاں دشمن کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر انہیں دریا کے پار فوراً جانے کا حکم دیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ پار جا کر صحیح پوزیشن لے لیتے ہیں،

مجھے وہاں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔

میں چکوٹھی پہنچا۔ وہاں پوزیشنوں کا انتخاب کیا جا چکا تھا اور ان پر کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جس بٹالین کو اس رات وہاں پہنچنا تھا اسے کہاں مورچہ بند کیا جائے۔ اس فیصلے کے لیے مجھے تمام تر صورتِ حال کا جائزہ لینا پڑا۔

میرا بریگیڈ انٹیلی جنس آفیسر آزاد کشمیر کے جی ایچ کیو سے دشمن کے متعلق وہ تمام معلومات اور اطلاعات لے آیا تھا جو اسے وہاں سے مل سکی تھیں۔ ان میں ان جنگی قیدیوں کے بیانات کی تفصیل تھی جو اگلے مورچوں میں گزشتہ مہینے ڈیڑھ کے دوران ہاتھ لگے تھے۔ ان سے انٹیلی جنس آفیسر نے دشمن کی صحیح نفری کا اندازہ کر لیا تھا اور دشمن کی پوزیشنوں کے بارے بھی معلوم کر لیے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اوڑی کے دونوں طرف دشمن کے دو بریگیڈ ہیں جنہیں اچھے خاصے توپ خانے کی مدد حاصل ہے۔ اوڑی میں دشمن کے چند ایک ہلکے ٹینک بھی تھے اور یہ تو معلوم ہی تھا کہ دشمن کو ایئر فورس کی بہت مدد حاصل ہے۔

دشمن کے مقابلے میں ہماری کوئی حیثیت نہیں تھی

ہمارے اندازے کے مطابق اس علاقے میں دشمن کی فورس اس طرح تھی — گیارہ بٹالینیں، دو اضافی پیادہ کمپنیاں، کشمیر ملیشیا، فیلڈ توپ خانے کی دو بیٹریاں، درمیانے توپ خانے کی دو بیٹریاں، ٹینک شکن توپوں کی ایک بیٹری اور ہلکے ٹینکوں کا ایک سکواڈرن۔ پیادہ بٹالینوں کی تعداد ایک ڈویژن جتنی تھی، لیکن دشمن کے چونکہ دو ہی بریگیڈ ہیڈکوارٹر تھے اس لیے کہا جا سکتا تھا کہ یہ ڈویژن نہیں بلکہ اصل سائز سے کہیں زیادہ بڑے دو بریگیڈ ہیں۔ ہم نے یہ اندازہ کیا کہ اوڑی کیمپ کے دفاع کے لیے دشمن دو یا تین بٹالینیں پیچھے رہنے دے گا اور ہم پر آٹھ یا نو بٹالینوں کا حملہ ہوگا۔

اس بے شمار نفری اور جنگی قوت کے مقابلے میں ہماری نفری صرف تین بٹالین تھی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ آزاد کشمیر آرمی کی ہی ہم سے دو بٹالینیں آ جاتیں۔ دو بٹالینوں کے علاوہ ہمارے پاس ایک اضافی کمپنی اور ایک بٹالین کی پلاٹون تھی۔ اگر ہم سکاؤٹس کو بھی اس نفری میں شامل کریں تو نفری اضافی بٹالین بنتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ قبائلی اور آزاد کشمیری بھی واپس ہمارے پاس آ جاتے تھے

دستیاب کر کے اور مزید نفری کمک لے کر حملہ کرے گا لیکن دشمن ہماری چھاپہ مار پارٹیوں کے تعاقب میں بائیں طرف کو پھیلتا گیا۔ چنانچہ کئی دنوں تک دشمن نے حملہ نہ کیا۔

دریا کے پار بھی دشمن نے جب دوری پر سامنے سے کوئی حملہ نہ کیا۔ البتہ ہماری اس پوزیشن کو کاٹنے کے لیے محاصرے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ دشمن اس پوزیشن کو عقب سے کاٹ کر ہماری پوزیشن کو وہاں سے ہٹ جانے پر مجبور کرنا چاہتا تھا یا بائیں پہلو سے اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ علاقہ بہت وسیع اور پہاڑیاں بلند تھیں۔ ان میں درے بھی متعدد تھے۔ لہٰذا خطرے کے ہر ایک مقام اور جگہ پر نظر رکھنا ممکن نہ تھا۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ پوزیشن اس لیے خاصا دشوار تھا کہ وہ سیاچن کے کام سے سرانجام دیتے تھے اور ہمیں اس کی نقل و حرکت کے متعلق بہت سی قیاس آرائیاں کرنی تھیں۔ اس مقصد کے لیے ہمارے پاس آزاد کشمیر کے مجاہدین کی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں تھیں۔ انہیں ہم اس طرح استعمال کرتے تھے کہ دشمن کی پیش قدمی سے کئی گھنٹے پہلے انہیں خطروں کے مقام پر بھیج دیتے تھے تاکہ دشمن کو روک سکیں

خوش قسمتی سے ہماری پارٹیاں بروقت پہنچ جاتیں اور کامیابی حاصل کر لیتی تھیں۔ بہت دنوں بعد دشمن بھی ساکت اور جامد ہو گیا اور ہم بھی۔

ہندوستانیوں کا ٹارگیٹ مظفرآباد تھا

اس دوران جب ہماری پارٹیاں دشمن سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں میں نے قبائلیوں کا ایک لشکر (کمپنی) اس مقصد کے لیے آگے بھیجا کہ دشمن کے بعض اگلے دستوں کو اس کی مین باڈی سے کاٹ دیں۔ قبائلیوں کا یہ لشکر آگے جا کر ہم سے کٹ گیا اور دشمن کی پوزیشنوں کے درمیان آ گیا۔ اس لیے اپنا مشن مکمل نہ کر سکا لیکن اس کی محض ایسی چال سے غیر متوقع نتائج حاصل ہوئے۔ ہندوستانیوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ہم ان پر پونچھ کی پہاڑی پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہم نے ان کے ایک وائرلیس پیغام سے معلوم کیا تھا۔ اس پیغام سے جو ہم نے بھی وائرلیس سیٹ کے ذریعے سن لیا تھا، یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ہندوستانی ہم پر حملہ کرنے کی بجائے اپنے دفاع کے فکر میں ہیں۔ ہم ان کی اس غلط فہمی اور خدشے کے پیش نظر کوئی کارروائی کر کے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ان کے خدشات کو پختہ کرنے کے لیے ہم نے دوتوشین توپوں سے جو ہمیں ابھی ابھی ملی

تھیں۔ اسی رات پانڈو کے سامنے کی ایک پہاڑی پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس کے فوراً بعد
قبائلیوں سے حملہ کرایا۔ یہ نہایت عمدہ حملہ تھا۔ دشمن کا فوری ردِعمل یہ تھا کہ اس نے چاروں
طرف روشنی کے راؤنڈ، پیراشوٹ والے روشنی فلیئر چھوڑے گئے اور توپیں فائر کرنی شروع کر دیں۔
فائر اس قدر زیادہ تھا کہ دشمن کی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ میں اس نتیجے
پر پہنچا کہ کچھ عرصے تک لم اور کم جب ڈوری کے سامنے کے متعلق کوئی پریشانی نہیں رہی۔

ہندوستانی دریا کے دونوں طرف ہماری دفاعی پوزیشنوں کے سامنے رک تو گئے تھے لیکن
صورت حال ابھی تک پریشان کن تھی۔ اس وقت تک دشمن کی پانچ سو نفری ہلاک و زخمی کی جا
چکی تھی لیکن دشمن کی نفری اتنی زیادہ تھی کہ اس نقصان کے باوجود اس کی طرف سے خطرے میں
کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہر رات پہرہ اور چوکیداری اور دیکھ بھال جاری رہی اور ہماری چھاپہ مار
پارٹیاں پہلے سے زیادہ شدت سے حملے کرتی رہیں جن سے ہندوستانیوں کے پہلوؤں کے دستے
سمٹتے چلے گئے۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے اور ہم دشمن کے بڑے حملے کا انتظار کرتے رہے
مگر بڑا حملہ کبھی نہ آیا۔

اس دوران دشمن نے شمال میں ٹیٹوال کی طرف چار بٹالینوں کے ایک بریگیڈ سے پیش قدمی
کی۔ وہاں ہماری صرف ایک نامکمل بٹالین تھی۔ یہ بیچاری بریگیڈ کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اس کے بعد وہ علاقہ
ایک الگ سیکٹر بنا دیا گیا۔ اس کی کمان بریگیڈیئر حاجی افتخار احمد کو دی گئی۔ اور یہ علاقہ میرے کنٹرول
سے نکل گیا۔ اس کے بعد ہماری جو نئی تنظیم کی گئی اس کے مطابق میرے بریگیڈ کو ایک اور بٹالین
اور دو فیلڈ توپیں دی گئیں جو میرے پاس جون کے وسط میں پہنچیں۔

جون کے آخر تک دشمن ہمارے ہاتھوں مزید پانچ چھ سو نفری ہلاک اور زخمی کروا چکا تھا اور اس
کا حملہ جو اس نے بڑے سخت پیمانے اور بڑے طمطراق سے شروع کیا تھا مکمل طور پر ساکت و جامد ہو گیا۔
ہم دشمن کی طرف سے جس ضرب کاری کی توقع لگائے بیٹھے تھے کبھی نہ آئی۔ دشمن نے ہماری
منتخب پوزیشنوں پر حملہ نہیں کیا تھا اگر کرتا تو اسے بہت جانی نقصان اٹھانا پڑتا۔ لہٰذا گزشتہ چار
ہفتوں میں دشمن نے بڑے حملے کے ضمن میں کوئی قدم آگے نہ بڑھایا۔ اس نے آگے بڑھ کر
حملہ کیا، نہ پہلوؤں پر حملہ کیا لیکن ہم اس پر سامنے سے بھی حملے کرتے رہے اور اس کے مورچوں
کے علاقے میں پارٹیاں بھیج کر گھات لگاتے اور اسے نقصان پہنچاتے رہے۔ ہم نے آگے تو صرف
سے حملہ کرا کے پہلوؤں اور عقب سے بھی پریشان کیا۔ اس سے ہم نے یہ کامیابی حاصل کی کہ دشمن

ڈویژن فوج نے ابتدا میں دریا کے دونوں طرف پیش قدمی کی اور چھمب اور جوڑیاں تک پہنچی تھی۔ اس کے پاس مزید حملوں کے لیے ابھی پانچ بٹالینیں تھیں۔ یہ فوج اب اسی مربع میل کے علاقے تک پھیل گئی تھی اور تھوڑے تھوڑے دستے بھگوڑوں کے تعاقب میں بھٹک رہی تھی۔

یہ تجزیہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستانی حملہ اس انداز سے کیوں رک گیا تھا۔ ہم نے انہیں رکنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ کوئی بڑی لڑائی بھی نہیں لڑی گئی تھی۔ ہندوستانیوں کا جانی اور مالی نقصان بھی زیادہ نہیں ہوا تھا۔ ان کی نفری اور فائر پاور میں بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی پھر بھی انہوں نے اپنا مقصد اور ارادہ ترک کر دیا۔

ہندوستانیوں نے یہ فوج پہلے ہوئے سے جمع کر رکھی تھی جس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے حملے کا پلان پہلے سے بنا رکھا تھا۔ ان کے حملے کا رخ سڑک کے ساتھ ساتھ اکھنور کی طرف تھا۔ حملے کی طاقت اور شدت بہت زیادہ تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ منظم طور پر فیصلہ کر کے جنگ کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تشہیر بھی اسی مقصد کی کی تھی لیکن انہوں نے یہ کبھی بھی نہیں کہا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ چھوٹے سے حملے کر کے رک جائیں گے یا اپنی طرف دفاعی پوزیشنوں کو مستحکم کریں گے۔ اگر ان کا مقصد صرف چھمب تک پہنچنا تھا تو انہوں نے جو ترتیب دیا اور مضبوط حملہ کیا تھا اس کے پیش نظر یہ مقصد محض بے معنی تھا۔ لہٰذا ان کا ٹارگیٹ اکھنور اور ان کا مقصد جنگ کا خاتمہ تھا۔

اس آپریشن کا پلان تیار کرتے وقت انہوں نے تمام ممکنہ احوال و واقعات کو پیش نظر رکھا ہوگا جن میں ہماری طاقت، اس میں متوقع اضافہ اور پاکستان سے کھلی جنگ بھی شامل ہوگا۔ انہیں علم ہو گیا تھا کہ پاکستان کے فوجی دستے محاذ پر موجود ہیں۔ انہیں توقع تھی کہ وہ جیت جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے آپریشن کا وقت اور مقام اپنی پسند کا چنا لیکن کچھ ہی منٹوں بعد وہ اس سے دست بردار ہو گئے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان کا یہ فیصلہ کسی بیرونی طاقت یا اقوام متحدہ کی مداخلت کے بغیر کیا گیا تھا یعنی ہندوستانیوں کا فیصلہ بدلنے میں کسی اور کا ہاتھ نہیں تھا۔ نہ ہی ان کے فیصلے میں تبدیلی کسی غیر مسئلے کے زیر اثر آئی تھی اور نہ ہی ہندوستانی لیڈروں کے عزائم بدلے تھے۔ لہٰذا یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے حملے کے پلان سے وہ صرف اس لیے دست بردار ہوئے کہ انہیں کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔

ہندوستانی لیڈروں اور کمانڈروں کے ذہنوں میں کیا آئی تھی اس کے سوا کوئی نہیں بتا

سکتا ہم صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔ پہلے چند دن تو وہ کسی دشواری کے بغیر پیش قدمی کرتے رہے اور جس طرح ان کے سامنے سے مزاحمت بتدریج اور نہایت آسانی سے ختم ہوتی گئی تھی اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ پھر وہ چکوٹھی اور جب تودری کی دو دفاعی مورچہ بندیوں کے بالمقابل آئے۔ انہوں نے ان پر سنجیدگی سے کوئی خاص حملہ نہ کیا۔ انہوں نے فضائی دیکھ بھال (ریکی) کی رپورٹوں اور ہماری فائرنگ سے یہ ضرور معلوم کر لیا ہوگا کہ ان دونوں مورچہ بندیوں میں صرف ایک ایک پلٹن ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے پاس نہ توپ خانہ ہے نہ طیارے نہ ٹینک۔ جب وہ چکوٹھی تک آئے تو ان پر عیاں ہو گیا تھا کہ یہاں صرف ایک بٹالین مورچہ بند ہے اور بڑی مستحکم پوزیشن ہے جس کا کوئی بھی حصہ اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس تمام مورچہ بندی پر حملہ کرنا پڑے گا۔ ہندوستانیوں کو فوج کے اس اصول سے واقفیت تھی کہ ایک پلٹن کی دفاعی پوزیشن کو توڑنے کے لیے ایک بریگیڈ سے حملہ کیا جاتا ہے۔ حملہ آور کی طاقت دفاع میں لڑنے والوں کا تین گنا ہونی چاہیے۔ ہماری اس پوزیشن کے بائیں پہلو پر دریا تھا اس لیے اس طرف سے حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سامنے گہرا نالہ تھا جس کی وجہ سے ہندوستانی سامنے سے بھی حملہ کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ صرف دایاں پہلو رہ گیا تھا لیکن اس طرف دشمن کو جنگل میں سے گزرنا تھا اور اسے قدم بہ قدم بہت سی اونچی پہاڑیوں پر قبضہ کرنا تھا۔ اس ابتدائی اقدام کے بغیر وہ اصل پوزیشن پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے لیے بہت سے دن درکار تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں کو یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس علاقے میں گئے تو وہ گھات لگانے والوں، چھپ کر فائر کرنے والوں اور قبائلیوں کی چھاپہ مار ٹولیوں کی زد میں آ جائیں گے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے دشمن کو کم از کم دو پلٹنیں درکار ہوتی تھیں۔ ہندوستانیوں کے پاس اس کام کے لیے پلٹنیں تو تھیں لیکن ان کے پاس صرف یہی ایک سڑک نہیں تھی۔ ابتدائی طور پر انہیں ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ اصل حملے کے لیے انہیں توپ خانے کی بے شمار گولہ باری کی ضرورت تھی اس کے لیے انہیں تمام تر توپ خانہ آگے مورچوں کے قریب لانا تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں ہمارے قبائلی چھاپہ مار اس کے توپ خانے پر آسانی سے شب خون مار سکتے تھے۔ لہٰذا توپ خانے کی حفاظت کے لیے بھی دشمن کو ایک پلٹن کی ضرورت تھی۔ ہندوستانیوں کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمارے پاس قبائلیوں کی نفری کتنی ہے۔ اگر ہم انہیں پارٹیوں میں منظم کر کے استعمال کرتے تو

ان حملوں کا تسلسل کبھی بھی نہ ٹوٹ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عنصر نے بھی ہندوستانیوں کو اپنے پلان پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا ہوگا اور اگر ہندوستانی تمام تر خطروں سے بچاؤ کا انتظام کر بھی لیتے تو بھی چکوٹھی پر حملے سے انہیں کیا حاصل ہوتا؟ یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کا جانی اور مالی نقصان بے تحاشہ ہوتا۔

اگر دشمن چکوٹھی پر کامیاب ہو جاتا تو ہم دو تین میل پیچھے ہٹ کر ایک اور متبادل مورچہ بندی قائم کر لیتے اور دشمن کو پہلے والی مہم ابتدا سے آخر تک ایک بار پھر سر کرنی پڑتی اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ہماری پیش قدمی کے دوران ہندوستانیوں کے پہلو کھلے ہی ہوتے جاتے اور قبائلی حملے کر کے انہیں سارے علاقے میں بکھیرتے رہتے۔ ہماری سرحد سے چند پوزیشنیں پوزیشنوں میں مورچہ بند تھیں۔ قبائلی اور کشمیری دشمن کے پہلوؤں پر کاری ضربیں لگاتے رہتے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا اور اگر ہندوستانی مظفرآباد پر قبضہ کرنا چاہتے تو انہیں انڈین آرمی کا بہت بڑا حصہ میدانِ جنگ میں جھونکنا پڑتا۔

اتنی بڑی فوج اس علاقے میں استعمال بھی نہ ہو سکتی۔ ایک ہی تنگ سی سڑک تھی۔ علاقہ پہاڑی تھا۔ سپلائی اور دیگر فوجی ضروریات کے پیشِ نظر یہاں اتنی بڑی فوج نہیں لائی جا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ علاقہ مکمل طور پر دشمن کی تحویل میں ہوتا اور وہ صورتِ حال کو اپنی پسند کے مطابق ڈھال لیتا۔ لیکن ہم ایسی صورتِ حال کو پاکستان آرمی سے کچھ اور دستے لا کر فوراً بدل سکتے تھے اور ہم اس پوزیشن میں تھے کہ صورتِ حال کا توازن تباہ کر دیتے۔

غالباً ہندوستانیوں نے یہ بھی سوچ لیا ہوگا کہ پاکستان آرمی کے دستوں کو یہاں سے ہٹائے بغیر کم از کم اس موقع پر مظفرآباد تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا چکوٹھی پر حملے کے لیے اتنا خون اور مال صرف کرنا بے مقصد ہے۔ ہماری طرف جو سوچ کام کر رہی تھی، وہ دشمن کے متعلق معلومات اور اطلاعات کی فراہمی سے ہمارے ذہنوں میں آ گئی تھی۔ وہ یوں بھی کہ بعض حالات میں قبائلیوں اور کشمیریوں کے چند ایک گھٹے ہوئے دستے جن میں نہایت منظم ہو، ایک بڑی فوج کو روک سکتے ہیں بشرطیکہ ایسی مربوط اور مضبوط پوزیشنیں ہوں جن کے گرد و نواح میں جنگی کارروائیاں جاری رکھ سکیں۔

ایک اور اہم سوال بھی سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں سے ناکام ہو کر ہندوستانیوں نے یہ جانتے ہوتے کہ پاکستان آرمی بھی کشمیر کی جنگ میں شریک ہے، فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے

پاکستان کے میدانوں میں بھی کیوں نہیں نکالا؟ —— انھوں نے غالباً یہ سوچا ہو گا کہ ایسے
اقدام سے وہ دنیا بھر کے سامنے بدنام ہو جائیں گے۔ علاوہ بریں انھیں محاذِ کشمیر کا اندازہ
معیاری تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ڈر گئے ہوں کہ پاکستان آرمی اور قبائلی پٹھان دوش بدوش ہو
کر ہمیں پاکستان کے میدانوں میں بھی نکل جائیں گے اور انڈین آرمی مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

قبائلیوں نے ہندوستانیوں کے ذہنوں پر کس قدر خوف ڈال رکھا تھا، وہ وی۔ پی۔ مینن کے
الفاظ میں سنیے۔ وہ اپنی کتاب INTEGRATION OF INDIAN STATE میں لکھتا
ہے —— میں نے جب ذاتی طور پر ہندوستانی حکومت سے سفارش کی تھی کہ ہندوستان سے کشمیر کا
الحاق منظور کر لیا جائے تو اس وقت میرے سامنے ایک اور صرف ایک مسئلہ قابل غور تھا کہ کشمیر
پر حملہ آوروں کی یلغار سے ہندوستان کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ محمود غزنوی کے وقت
سے یعنی کئی صدیوں سے ہندوستان شمال مغرب کی طرف سے حملوں کی زد میں رہا ہے۔ صرف
مغلیہ دورِ حکومت میں وقفہ آیا تھا۔ پہلے محمود غزنوی نے سترہ حملے کیے تھے اور اب مملکت
پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد دس ہی ہفتوں کے اندر پاکستان نے پہلا اقدام یہ کیا کہ
شمال مغرب سے قبائلی حملہ کرا دیا۔ آج سرینگر ہے تو کل دہلی کی باری ہو گی۔ جو قوم اپنی تاریخ اور اپنے
جغرافیے کو بھول جاتی ہے وہ تباہی سے دوچار ہوتی ہے۔"

بہر حال وجوہات خواہ کچھ بھی تھیں، یہ حقیقت ہے کہ جنگ نہ ہوئی اور اگر ہندوستان جنگ
کرنا چاہتا تو اس کے لیے یہ موقع بہت ہی اچھا تھا۔ وہ ہماری زیادہ سے زیادہ فوج کو کشمیر
کے کسی خطے میں پنجاب کے میدانوں سے بہت دور گھسیٹ کر لے جا سکتا تھا۔

اس وقت میرا تاثر یہ تھا کہ اگر ہماری یہ کارروائی جنگ نہیں چھیڑ سکتی تو کشمیر میں ہماری کسی بھی
کارروائی سے دونوں ملکوں کے درمیان جنگ نہیں چھڑ سکتی کیونکہ دونوں ملکوں کے لیے جنگ موزوں نہیں تھی۔

بارھواں باب

پانڈو پر قبضہ

ہندوستانیوں کا حملہ تو ختم ہو گیا تھا لیکن اوڑی فرنٹ پر ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی تھی۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں، شب خون اور چھاپے، گولہ باری اور ہوائی حملے وہاں روز مرہ کا معمول تھا۔ دونوں طرف جانی نقصان ہو رہا تھا۔ ہمارے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ دفاعی مورچوں کو بہتر بنائیں۔ پانڈو پہاڑی کی ایک ڈھلان پر دشمن کے [illegible] توپخانے کی ایک سیکشن، دریا کی دوسری طرف ایسی جگہ پوزیشن میں تھی کہ گزشتہ تین ہفتوں سے پل بھی اور اس کے پیچھے سڑک کی پانچ میل لمبائی مسلسل گولہ باری کی زد میں تھی۔ یہ سیکشن چونکہ بلندی پر تھی اس لیے رات کے وقت بھی ہماری نقل و حرکت محفوظ نہیں تھی۔

ان توپوں کو ختم کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ نہ ان پر الگ تھلگ حملہ کیا جا سکتا تھا۔ بس ایک طریقہ تھا کہ پانڈو پہاڑی پر قبضہ کیا جائے۔ ہمارے آدمی یہی چاہتے تھے لیکن یہ بہت کٹھن مہم تھی جس کے لیے ہمارے پاس ذرائع نہیں تھے اور یہ مہم ہمارے رول میں بھی نہیں تھی کیونکہ ہمارا رول دفاعی تھا۔ تاہم فورس کمانڈر نے اجازت دے دی۔

پانڈو ایک گاؤں کا نام ہے جو اس نو ہزار فٹ بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ پہاڑی کا نام بھی پانڈو ہے جو دراصل ایک پہاڑی نہیں بلکہ وسیع علاقے پر پھیلا ہوا سلسلہ کوہ ہے۔ جب اوڑی کی چوکی پر کھڑے ہو کر دشمن کی طرف دیکھو تو پانڈو سامنے نظر آتا ہے۔ دائیں طرف تین ہزار فٹ نیچے دریائے جہلم نظر آتا ہے۔ دریا کے پار سڑک نظر آتی ہے جو پہاڑ کے پہلوؤں کو کاٹ کر گزرتی ہے۔ سڑک سے دور پرے سات آٹھ ہزار فٹ بلند پہاڑیاں

ہیں۔ بیب ڈوری کے بائیں طرف دس ہزار فٹ بلند نانگا ٹیک ہے جو بیب ڈوری کے اوپر جھکا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے ذرا آگے ساڑھے گیارہ ہزار فٹ بلند روسی کوتا ہے اور اس کے ذرا سامنے ساڑھے دس ہزار فٹ بلند سنگ ہے۔ اگر سامنے دیکھیں تو پہاڑیوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو دریا کے متوازی ہے۔ اس سلسلۂ کوہ کے درمیان پانڈو گاؤں واقع ہے جو برسات کے موسم میں دھند یا بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔

اگر پانڈو تک دیکھنے کے لیے جائیے کہ وہاں کی زمین کیسی ہے تو بیب ڈوری کی چھ ہزار فٹ بلندی سے اڑھائی ہزار فٹ بلندی تک آنا پڑے گا جہاں دریا کو پار کرنا ہے۔ اس علاقے میں جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات کی ہے لیکن نالے اور چٹانیں نہایت اچھی اوٹ اور آڑ مہیا کرتی ہیں۔ بیب ڈوری کے دامن میں ایک ندی پار کرنی پڑے گی جو برسات کے موسم میں سیلابی ہوتی ہے۔ اس سیدھی پہاڑی سے ذرا دور بالکل سامنے تین چوٹیاں ہیں جن کی بلندی چھ ہزار تین سو فٹ سے سات ہزار فٹ تک ہے۔ ان چوٹیوں والی پہاڑی درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور اس وقت تینوں چوٹیاں دشمن کے قبضے میں تھیں۔

پانڈو کا علاقہ

قاضی ناگ
۱۲۰۵۰۰
سنگ
۱۰۵۰۰
روسی کوتا
۱۱۵۰۰
چھوٹا قاضی ناگ
۱۰۰۰۰
پانڈو
۹۰۰۰
۶۰۰۰
۹۳۰۰
نانگا ٹیک
۱۰۰۰۰
۶۳۰۰
بیب ڈوری
۶۰۰۰
دریا
سڑک

بائیں طرف کی چوٹی سے ایک پہاڑی شروع ہوتی ہے جو تقریباً ڈیڑھ میل لمبی ہے اور اوپر پانڈو تک جاتی ہے۔ یہ تنگ پہاڑی ہے اور گھنے درختوں میں ڈھکی ہوئی۔ وہاں نظر زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتی اور پہاڑی دشوار گزار ہے۔ اگر اس پہاڑی کے راستے پانڈو پر حملہ کیا جائے تو پیش قدمی کے دوران شدید جنگ لڑنی پڑتی تھی کیونکہ ہر ایک پوزیشن پر سامنے سے حملہ کرنا پڑتا تھا اور ہر ایک پوزیشن بلندی پر تھی۔ اس حال میں تمام تزویراتی فوائد دشمن کو حاصل تھے جو ان پوزیشنوں میں مورچہ بند تھا۔ ہندوستانیوں کی ایک مورچہ بندی اس پہاڑی کے درمیان میں تھی۔

پانڈو کی طرف جائیے تو اس پہاڑی سے دائیں اور بائیں سے کئی چھوٹی بڑی پہاڑیاں ملتی ہیں جو تنگ ہیں، ڈھلانیں عمودی اور ان پر درختوں کے گھنے جنگل ہیں۔ ان پر بھی ہندوستانیوں نے پوسٹیں بنا رکھی تھیں۔ پانڈو سے ذرا اس طرف درخت ختم ہو جاتے ہیں پھر ایک چوٹی آجاتی ہے جس پر گھاس کی ہریالی ہے۔ یہ پچاس سے دو سو گز چوڑی اور سات آٹھ سو گز لمبی ہے۔ اس پر ہندوستانیوں کا قبضہ تھا۔ اس پر حملہ کرنے کے لیے ہمیں چڑھائی چڑھنی تھی اور اس کھلی جگہ سے گزرنا تھا۔ یہاں ہمیں دشمن کی آگ کی بارش کا سامنا کرنا تھا اور اس آگ سے زندہ گزر جانا کسی صورت ممکن نہ تھا۔

پانڈو سے یہ پہاڑی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دائیں والی کی انتہائی بلندی نو ہزار تین سو فٹ ہے۔ وہاں سے دریا، اس سے پرے سڑک اور ہمارے چکوٹھی کے ٹروپس اچھی طرح نظر آتے تھے۔ بائیں والا حصہ دو حصوں میں ہو کر دو میل پرے پھیلا ہو جاتا ہے۔ پھوٹا تاتھی نگ پر اس کی بلندی دس ہزار فٹ ہے اور آگے جا کر دائیں طرف تاتھی نگ پر اس کی بلندی ساڑھے تیرہ ہزار فٹ ہے۔

پانڈو نوالہ تر نہیں تھا

یہ تھا وہ تمام علاقہ جسے ہم نے مجموعی طور پر پانڈو کہا تھا۔ اس علاقے کو جو جنگی اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہم نے اسے چوکور ٹاپ نام دیا تھا وہ درست تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا تھا کہ ہندوستانیوں نے اسے چوکور ٹاپ نام دیا۔ وہ ذرا اونچا تھا۔ وہاں

کے مقامی لوگ بھی اسے بہت اہم سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں یہ روایت عام تھی کہ صدیاں گزریں ایک مغل بادشاہ کی فوج کو یہاں روکا گیا تھا۔ پھر مغلوں کی یہ فوج درہ پیر پنجال کے راستے گئی تھی۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ پانڈو ناقابلِ تسخیر ہے۔

اس علاقے میں دشمن کی نفری ہماری نسبت بہت زیادہ تھی۔ لہٰذا ہماری کامیابی کا دارومدار اس چال پر تھا کہ ہم کسی ایسے مقام پر حملہ کریں جو دشمن کے لیے اہم اور نازک ہو اور جہاں وہ اپنی تمام نفری کو لڑانے کے لیے نہ لا سکے۔ پانڈو کا گاؤں ہی ایسا ایک مقام تھا جو ہماری چال کے لیے موزوں تھا۔ اس گاؤں میں دشمن کا ہیڈ کوارٹر تھا جو اس تمام علاقے میں مورچہ بند ہندوستانی فوج کا دماغ اور ذہن تھا — اور اس کے اردگرد دشمن نے جس طرح اپنی فوج کو پھیلایا اور مورچہ بند کیا تھا وہ ناقص تھا۔

چکوٹھی اور ہیٹ ڈوری میں ہماری جو پوزیشنیں تھیں وہ ایک ایک بٹالین کی اسی مستحکم اور گتھی ہوئی مورچہ بندی تھی جسے توڑنے کے لیے دشمن کے لیے ضروری تھا کہ ہر بٹالین پہ الگ الگ حملہ کرے اور حملے کے لیے تین پلٹنوں کے بریگیڈ کی ضرورت تھی گویا ہماری دونوں پوزیشنوں پر حملے کے لیے دو بریگیڈ درکار تھے۔ دشمن کی کوئی ایک بھی پوزیشن

اتنی مضبوطی کی حامل نہیں تھی۔ اس نے تھوڑی تھوڑی نفری کی تمام پوزیشنیں علاقے میں بکھیر رکھی تھیں۔ دشمن کو ہماری چھاپہ مار کارروائیوں نے مجبور کر دیا تھا کہ اپنی پوزیشنیں بکھیر دے۔ ہماری چھاپہ مار پارٹیوں نے یہ کامیابی نہایت دلیری کا مظاہرہ کر کے حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ یہ دشمن کی غلط چالوں کا نتیجہ تھا۔ دشمن کی ہر پوزیشن میں ایک یا دو کمپنیاں مورچہ بند تھیں اور پوزیشنیں ایک دوسری سے اتنی دور کہ ایک دوسری کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔

پانڈو کے گاؤں میں بھی معلوم ہوتا تھا کہ دشمن نصف بٹالین ہے۔ اگر ہمیں یہیں حملہ کرنا تھا تو جنگی اصولوں کے مطابق ہمیں ڈیڑھ بٹالین کی ضرورت تھی۔ مگر احوال و کوائف ایسے تھے کہ ہمیں جو کل نفری جمع کر سکتا تھا، وہ ڈیڑھ بٹالین ہی تھی۔ اس کا ایک حصہ پیچھے ریزرو میں رکھنا تھا۔ پیچھے ایک بٹالین رہتی تھی جو دشمن سے دگنی تھی۔ اصول کے مطابق یہ کم نہیں تھی۔ تاہم میں نے سوچا کہ قبائلیوں اور کشمیریوں کو ملا کر حملے کے لیے نفری کافی ہو جاتی ہے۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہم راستے میں دشمن کے کسی دستے سے ٹکرائے بغیر ٹارگیٹ تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے اور پانڈو کے درمیان سات ہزار فٹ بلند پہاڑیوں کا پردہ حائل تھا۔ اس پر دو ہندوستانی کمپنیوں کا قبضہ تھا۔ بائیں طرف ہنگ پر بھی دشمن کی دو کمپنیاں تھیں اور پانڈو کی طرف جانے والے ممکنہ راستوں پر بھی دشمن کی چھوٹی چھوٹی پوزیشنیں تھیں۔ اگر ہم ان میں سے کسی ایک پر بھی حملہ کرتے تو اس پر قبضہ کرنے کے لیے ہماری تمام طاقت صرف ہو جاتی اور اس سے ہمیں کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ اگر ہم سیدھے پانڈو جا پہنچتے اور اس پر قبضہ کر لیتے تو دشمن کو تمام پوزیشنیں پسپا کرنی پڑتیں۔ بلکہ یہ توقع بھی رکھی جا سکتی تھی کہ بعض پوزیشنوں کی نفری منتشر ہو جاتی۔ چنانچہ یہ خیال تھا کہ پانڈو کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہی ہمارا ٹارگیٹ تھا۔ لہٰذا ہمارا ابتدائی اور بنیادی کام یہ تھا کہ ایسا راستہ دیکھیں جو ہمیں کہیں تصادم کے بغیر پانڈو کے قریب لے جائے۔

ریکی اور دیکھ بھال سے یہ امید بندھ گئی کہ ایسا راستہ مل سکتا ہے لیکن یہ ایسا آپریشن تھا جس میں ہمیں دشمن کے سامنے سے رات کے وقت چوری چھپے اور دبے پاؤں گزرنا تھا۔ ہمیں اس کی پوزیشنوں کے درمیان خاصا فاصلہ طے کرنا اور تاریکی میں چھ ہزار فٹ بلندی چڑھنی تھی اور اس کے بعد حملے سے پہلے کچھ دیر کے لیے کہیں آرام بھی کرنا تھا۔ یہ سب کچھ صرف ایک رات میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے دو راتیں درکار تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں دو راتیں اور ایک دن دشمن کے علاقے میں اس کے اگلے مورچوں کے عقب میں رہنا تھا اور یہ بھی کہ ہمیں اپنے آپ کو مکمل طور پر چھپائے رکھنا تھا۔ اس طرح ہمیں چھتیس گھنٹوں کے لیے بہت بڑا خطرہ مول لینا تھا۔ ہمارا سراغ مل جانے کی صورت میں دشمن ہمیں اپنے مرکز سے کاٹ دیتا اور ہم پکڑے بھی جا سکتے تھے ـــ میں نے یہ خطرہ قبول کر لیا کیونکہ اس کے بغیر کامیابی کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں تھا۔

حملے کی تیاریوں میں چند دن لگ گئے۔ سپلائی اور ایمونیشن وغیرہ آگے لے جانا تھا۔ سیپرز نے دریا کے پار لوہے کا موٹا رسہ لگا دیا۔ اس رسے کی مدد سے بیک وقت دو آدمی

ایک ٹکڑے میں تین سو پاؤنڈ وزنی سامان دریا کے پار لے جایا جا سکتا تھا۔ ڈسپ
ذخیرے سے آگے قلیوں کی ضرورت تھی قلی جمع کر لیے گئے۔ اس آپریشن میں دو ہزار
قلی استعمال کیے گئے تھے۔ توپخانے کو اتنا آگے لے جایا گیا جہاں سے ٹارگیٹ کو زد میں لیا
جا سکتا تھا۔ ہمارے پاس نو سو گولے تھے۔ یہ تعداد اُس تعداد سے بہت ہی کم تھی جو دشمن
کے پاس تھی۔ آپریشن کے دوران دشمن نے ہم پر صرف ایک دن میں کم و بیش تین ہزار گولے
فائر کیے تھے —— ہمارے پاس تین سو محسود قبائلی تھے۔ انہیں تین لشکروں میں
تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہر لشکر کی نفری ایک سو تھی۔ دو کا کام یہ تھا کہ دشمن پر چھاپے مار کر
اسے چین نہ لینے دیں۔ تیسرے لشکر کے ذمے یہ کام تھا کہ اگر دشمن کو اکھاڑنے میں
کامیاب ہو جائیں تو یہ ایک سو قبائلی دشمن کا تعاقب کریں۔ اس لشکر کو ہم نے ایل-۳
کا نام دیا تھا۔ آخری کام یہ تھا کہ ہیڈ ورجی کے سامنے جو ندی تھی اس پر لکڑی کا
پُل بنایا جاتا۔ یہ پل آخری رات بنا لیا گیا —— ۱۰ جولائی تک ہم بالکل تیار تھے۔

اگلے دن سورج غروب ہونے کے بعد ہماری حملہ آور فورس جو صرف ایک بٹالین تھی
ندی پار کر گئی اور چوری چھپے دشمن کے علاقے میں گھس گئی۔ بارش ہونے لگی تھی جس
سے پیش قدمی میں کچھ رکاوٹ پیدا ہو گئی لیکن بارش کا یہ فائدہ ہوا کہ ہماری بٹالین
کی کوئی آواز دشمن کو سنائی نہ دی۔ جوں جوں بٹالین بڑھتی جا رہی تھی، جوان ٹیلی فون
کا تار بچھاتے چلے جا رہے تھے۔ اس طرح بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں میرے ساتھ بٹالین کا
رابطہ قائم رہا۔ وائرلیس سیٹ بھی آگے لے جائے گئے تھے لیکن خاموش رکھے گئے تھے۔
انہیں شدید جنگی حالات میں استعمال کرنا تھا۔ چند گھنٹے بعد بٹالین اگلے خفیہ اڈے
پر پہنچ گئی۔ وہ اب دشمن کے اگلے مورچوں کے عقب میں ایک میل سے زیادہ دور چلی گئی
تھی۔ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

پہلی رات

دشمن کی پوزیشنیں
ہماری پیشقدمی
ہمارا خفیہ اڈہ

اگلے دن جو آپریشن کا دوسرا دن تھا، حملہ آور فوج کو رات کا اندھیرا چھانے تک خفیہ اڈے میں چھپے رہنا تھا۔ ہماری انتہائی کوشش رہی کہ دشمن کو پتہ نہ چلے کہ کوئی غیر معمولی کارروائی ہونے والی ہے۔ اُس صبح میں نے سپاہیوں، آزاد کشمیر لیویز اور سکاؤٹس کی چھاپہ مار پارٹیوں کو مختلف مقامات پر دشمن پر چھاپے مارنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کارروائی سے دشمن کو کسی بڑے حملے کا شک نہیں ہو سکتا تھا۔

اُس روز مطلع ابر آلود تھا اور بارش بھی وقفے وقفے سے برستی تھی۔ اس لیے دشمن کے [illegible]۔ چھاپہ مار پارٹیوں نے دشمن کو خوب پریشان کیا اور اسے اپنے ساتھ الجھائے رکھا۔ یہ کارروائی نہایت کامیابی سے جاری رہی سوائے ایک واقعہ کے جو

خطرناک ہو سکتا تھا۔ ہمارا یوں کہ حملہ آور فوج کی ایک ریکی پارٹی دشمن کی ایک گشتی پارٹی کے بہت قریب چلی گئی۔ فوجی تو فوراً پیچھے ہٹ آئے لیکن ان کا گائیڈ کیچڑ میں پھسل کر گر پڑا اور اسے دشمن نے پکڑ لیا۔ اسے ہندوستانی سپاہی پانڈو اپنے ہیڈکوارٹر میں لے گئے۔ اس سے گہری پوچھ گچھ کی گئی۔ لیکن اس نے دشمن کو کوئی بات نہ بتائی۔ ہم بہت پریشان تھے لیکن شام تک ہمیں یقین ہو گیا کہ سب ٹھیک ہے۔ دوسری رات حملہ آور فورس اور آگے بڑھنے کے لیے تیار تھی۔

ہماری حملہ آور بٹالین دو کالموں میں (ایک دائیں ایک بائیں) دو مختلف راستوں سے پانڈو کی طرف بڑھنے لگی۔ ان دو کالموں کا پہلا کام یہ تھا کہ پہنچ کر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ جائیں۔ ان کے لیے لازمی تھا کہ وہاں تک وہ اس طرح پہنچیں کہ دشمن کو ان کی بھنک نہ ملے۔ پانڈو پر کامیاب حملہ کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ پیشتر اس کے کہ دشمن کمک منگوائے ہم حملہ کر دیں۔ دونوں کالموں کے راستے دشوار تھے۔ دونوں کو پانچ ہزار

دوسری رات

فٹ سے زیادہ بلندی پر رات کے وقت چڑھنا تھا۔ رات تاریک تھی اور کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ پہاڑی نوکیلی تھی اور کئی جگہوں پر عمودی چٹانیں تھیں۔ یہاں مٹی تھی

وہاں کیچڑ تھا اور جہاں چٹانیں تھیں وہاں سے پاؤں پھسلتے تھے کسی بھی معیار پر
پرکھو تو یہ مہم بہت ہی دشوار تھی۔ قدرتی طور پر ہم پریشان بھی تھے اور ہم پر ہیجان بھی
طاری تھا اور دل پر کئی شدتیں سوار تھے۔

اگلی صبح ہمیں ایک خوشخبری ملی —— حملہ آور بٹالین کا دایاں کالم پانڈو کے پہلو میں
ایک زبردست تین سو فٹ بلند چوٹی پر پہنچ گیا تھا۔ یہ چوٹی پانڈو سے اس طرح بلند تھی جیسے اس
کے سر پر کھڑی ہو۔ اس کالم کو یہی مقصود تھا۔ دشمن کو خبر مل گئی۔ اس نے عجلت میں جوابی
حملہ کیا جو قطعی بے اثر ثابت ہوا۔ اس دن کے پچھلے پہر دایاں کالم پانڈو سے پانچ سو گز
دور رہ گیا تھا جہاں اس نے بائیں کالم کا انتظار کیا کہ وہ آگے آ جائے —— یہاں تک
ہمارا آپریشن میری توقعات سے بڑھ کر کامیاب تھا۔ میں بہت ہی خوش تھا۔ دشمن
کو ہم نے بے خبری میں جا لیا تھا۔ اب فوراً ہی حملہ شروع ہونے والا اور لڑائی ختم ہونے
والی تھی۔

ہماری کڑی آزمائش

مگر بایاں کالم وقت پر آگے نہ آسکا۔ اسے راستے میں کئی ایک ناخوشگواریوں کا سامنا
کرنا پڑا جن کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ وہ جس راستے سے گیا تھا وہ بہت ہی زیادہ دشوار گزار
ثابت ہوا۔ اندھیرے میں جب یہ کالم نالہ اوپر چلا گیا تھا، ٹیلی فون تار کا ڈرم جس پر سارا
تار لپٹا ہوا ہوتا ہے، بلندی سے لڑھک کر نیچے گرا۔ اس کا نتیجہ پیشقدمی میں تاخیر کے
علاوہ یہ ہوا کہ کالم کا میرے ساتھ رابطہ ٹوٹ گیا۔ رات آدھی گزر گئی تھی پھر یہ کالم دشمن کی
ایسی تنگ پوزیشن سے جا ٹکرایا جو غیر متوقع طور پر راستے میں آگئی تھی۔ یہاں کالم کو رکنا
پڑا جس میں کالم کو تیس جوانوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ پو پھٹنے تک یہ کالم ابھی منزل سے
ابھی بہت دور تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ پیش آگئی تھی کہ دشمن کو اس کا علم ہو گیا تھا۔
اس لیے اس پر بے تحاشا گولہ باری ہو رہی تھی۔

ان دشواریوں کے باوجود اس کالم نے بلندی کی طرف پیش قدمی جاری رکھی جو اس
کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی۔ اس دوران اس پر ایک اور زک لگی۔ چند دشمنوں کی

ایک پارٹی پیچھے جا رہی تھی۔ وہ ہمارے کالم کے درمیان آ گئی۔ اس سے جو جھڑپ ہوئی اس نے کالم کو اور زیادہ غیر منظم کر دیا۔ شام کے وقت یہ کالم حملے کی اجتماع گاہ تک پہنچا۔ مگر کئی گھنٹے کی تاخیر ہو گئی تھی۔ اس کالم میں پہلے والا جوش و خروش اور حوصلہ نہیں رہ گیا تھا اور نہ ہی اس کی تنظیم اور ترتیب تسلی بخش تھی۔ تاہم اسی کیفیت میں وہ پانڈو پر حملے میں شریک ہوا۔

اس کا حملہ بالکل ناکام رہا جس کے نتیجے میں اس میں انتشار پیدا ہو گیا۔ تاریکی کی وجہ سے کنٹرول اور کمانڈ بھی ختم ہو گئی۔ افسر اور جوان ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ تھکے ہوئے تھے اور ان میں بددلی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جوان فرداً فرداً کسی کی اجازت اور حکم کے بغیر ہی پیچھے آنے لگے۔ یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ آدھی رات کے وقت میرے ان احکام کے باوجود کہ کوئی جوان پیچھے نہ ہٹے، پورے کا پورا بایاں کالم سرپٹ پسپا ہو رہا تھا۔ صبح چار بجے تک یہ تمام کالم دشمن کے علاقے سے باہر نکل آیا اور سیب ڈوری کے قریب اسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے پیش قدمی شروع ہوئی تھی۔ صبح کے وقت سب ٹکڑیوں، کشتیوں اور سکاؤٹس کی چھاپہ مار پارٹیوں نے دیکھا کہ بایاں کالم پیچھے چلا گیا ہے۔ وہ بھی یہ سمجھ کر کہ آپریشن ختم ہو گیا ہے، پیچھے آ گئیں۔

اس صورت حال کے نتیجے میں آپریشن کے چوتھے دن کی صبح ہمارا دایاں کالم نصف بٹالین دشمن کے علاقے میں آگے رہ گیا۔ وہ ہم سے کٹ کر نو ہزار تین سو فٹ بلند چوٹی پر رہ گیا تھا۔ اس پر دشمن کا توپ خانہ گولہ باری کر رہا تھا اور طیارے اس پر بم، راکٹ اور گولیاں برسا رہے تھے۔ یہ صورت حال پریشان کن اور مایوس کن تھی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اتنی مایوس کن نہیں جتنی کہ ایک نظر دیکھنے میں دکھائی دیتی تھی۔ ابھی دو عناصر ہمارے حق میں تھے۔ ایک یہ کہ یہ کالم یعنی دایاں کالم پیچھے سے کٹ گیا تھا لیکن اس نے خوبی اور استحکام سے قدم جما رکھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اسے کمک مل جائے تو وہ حملہ کر سکتا ہے۔ مگر کمک کے پہنچنے کے لیے چوبیس گھنٹے درکار تھے۔ اس وقت تک کالم کو اکیلے اور ہم سے منقطع رہنا تھا۔ میں نے ریزرو کی آدھی بٹالین کو حکم دیا کہ وہ اسی رات آگے جائے، نو ہزار تین سو فٹ بلند چوٹی پر دائیں کالم سے جا ملے اور اگلے روز پانڈو پر آخری اور فیصلہ کن حملہ کرے۔

دوسرا عنصر جو ہمارے حق میں تھا وہ یہ تھا کہ دشمن ہمارے دستوں کو اپنے مورچوں کے علاقے کے اندر غیر متوقع طور پر دیکھ کر بوکھلا اٹھا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے ابھی علم نہیں ہوا کہ ہمارا ایک کالم پیچھے آگیا ہے۔ دشمن کے ارد گرد ہماری کچھ چھاپہ مار پارٹیاں ابھی تک اسے پریشان کر رہی تھیں جس سے دشمن کو کچھ سوجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا دایاں کالم ابھی اس کے سر پر بیٹھا تھا۔ دشمن کو اس کی نفری کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ دشمن ہمارے اگلے اقدام کا انتظار کرے گا۔ وہ کوئی اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ہمیں اب کرنا یہ تھا کہ دشمن کو چین نہ لینے دیں نہ اسے اطمینان سے سوچنے کی مہلت دیں۔ چنانچہ میں نے چھاپہ مار پارٹیوں کو اس ہدایت کے ساتھ آگے بھیج دیا کہ دشمن پر تابڑ توڑ چھاپے ماریں۔

اگلے روز جو پانچواں دن تھا، کمک دائیں کالم سے جا ملی۔ اب توقع رکھی جا سکتی تھی کہ چند گھنٹوں کے اندر پانڈو پر قبضہ کیا جا سکے گا۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ افسروں اور جوانوں میں تشکیک و شبہات اور جھجک پائی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس حملے کے لیے ہمیں جو برتری اور بالادستی حاصل تھی وہ اب نہیں رہی تھی۔ ہمارے افسر اور جوان اس جھجک میں حق بجانب تھے۔ ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ دشمن کے لیے ہمارا پانڈو پر حملہ اچانک ہوگا اور ہم دشمن کو بے خبری میں جا لیں گے۔ اس کے علاوہ ہماری حملہ آور نفری دشمن کی نسبت دگنی ہوگی مگر اب ہم ان فوائد سے محروم ہو گئے تھے۔

اب جب کہ دونوں طرف کے دستے نو ہزار فٹ اونچی پہاڑی پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے اور ان کا درمیانی فاصلہ پانچ سو گز تھا تو دونوں طرفوں کی نفری کا تقابل ہمارے حق میں نہیں تھا۔ ہندوستانیوں کی جو نفری اگلی دو پوزیشنوں سے پسپا ہوئی تھی پانڈو کی نفری سے جا ملی تھی۔ اس طرح دشمن کی نفری ہم سے زیادہ ہو گئی تھی اور انہیں کچھ مزید فوائد حاصل ہو گئے تھے۔ دشمن نہایت اچھے مورچوں میں بیٹھا تھا جب کہ ہمیں کھلے علاقے میں سے آگے بڑھنا اور حملہ کرنا تھا۔ دشمن کے پاس بہت سی مشین گنیں تھیں۔ ہمارے پاس ایک بھی نہیں تھی۔ دشمن کو مدد دینے کے لیے طیارے تھے۔ ہمارے پاس کوئی طیارہ نہیں تھا اور دشمن کا توپخانہ ہمارے توپخانے سے چار گنا زیادہ تھا۔

پانچواں دن

اس تقابل کو دیکھتے ہوئے جو کسی پہلو ہمارے حق میں نہیں تھا، دوائیں کالم کے
کمانڈر کو توقع تھی کہ حملہ شروع کر دیا جائے گا۔ میں نے کسی مزید حملے یا تذبذب کی گنجائش
نہ رہنے دی اور حکم دے دیا کہ "لی" پانڈو پر ٹینکوں سے حملہ کر دیا جائے اور حملے کی تعداد
افسر کریں (یعنی انفسرا) کے ہیں — میں نے یہ ناگوار سا حکم اس عنصر کے پیش نظر دیا تھا کہ
مجھے یقین تھا کہ دشمن بوکھلایا ہوا ہے اور اسے کچھ سوجھ نہیں پڑ رہا۔ یہ ایسا عنصر تھا جو
دیکھا نہیں جا سکتا تھا، محسوس کیا جا رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ دشمن میری توقعات سے
کہیں زیادہ بڑھ کر بوکھلایا اور گھبرایا ہوا تھا۔

جب ایک روز پہلے چھاپہ مار پارٹیاں آگے گئی تھیں تو ان میں سے بعض کا خیال تھا
کہ دشمن بھاگ رہا ہے۔ توپخانیوں کا ایک افسر ایک سواری بہت تیزی سے آگے چلا
گیا تھا اور اندھیرے میں سیدھا پانڈو میں جا گھسا تھا۔ اسے تو دشمن نے مقابلہ کر کے

پیچھے ہٹا دیا تھا لیکن دوسرے لشکر نے فائرنگ کی آواز سنی تو وہ بھی دوسری سمت سے اسی جگہ ٹوٹ پڑا اور ایک معرکہ لڑا گیا۔ یہ لڑائی شام تک جاری رہی جس کی نوعیت معمولی قسم کی جھڑپوں کی تھی لیکن دشمن نے اسے بڑا حملہ سمجھ لیا تھا۔

جنگل کی آگ اور صوبیدار کالا خان کی روح

ہمارے اگلے دستوں نے دیکھ لیا کہ دائیں کالم کو حملہ کرنے کے لیے اگلے دن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ رات ابھی بہت سی باقی تھی بلکہ صبح ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ چنانچہ انہیں یہ کئی گھنٹے اوپر پہاڑی پر ہی گزارنے پڑے۔ اس بلندی پر سردی خاصی کڑاکے کی تھی۔ اتنی سردی اتنی دیر تک متواتر برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ ہمارے افسروں اور جوانوں نے احتیاطی تدابیر کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیے جگہ جگہ آگ جلالی۔ وہ تھا تو جنگل لیکن رات کے اندھیرے میں آگ کہاں چھپ سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ دشمن میں گھرے بیٹھے ہیں اور دشمن کو چوکنا کیے بیٹھا ہے۔

لیکن ان کی اس بے احتیاطی نے کوئی اور ہی کرشمہ کر دکھایا۔ ہندوستانیوں نے دیکھا کہ پانڈو کے اردگرد جگہ جگہ آگ جل اٹھی ہے۔ وہاں ایک مقامی باشندہ بھی تھا۔ اس نے بعد میں بتایا کہ ہندوستانیوں کو شک ہو گیا تھا کہ وہ گھیرے میں آ گئے ہیں۔ اس غلط فہمی نے ان میں گھبراہٹ پیدا کر دی۔ رات کے وقت وہ کوئی جوابی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ ان کے مورچوں میں بے دلی اور گھبراہٹ بڑھتی رہی۔ انہوں نے رات خوف و انتظار میں گزاری۔ اور اپنے اردگرد کے الاؤ سے ڈرتے رہے۔ صبح ہوئی تو انہیں یہ تو علم ہو گیا کہ وہ گھیرے میں نہیں ہیں لیکن اس سے انہیں کوئی اطمینان نہ ہوا۔ اگر اطمینان ہوا بھی تو صرف اتنا کہ ان کے گرد گھیرا مکمل نہیں ہے لہٰذا وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہندوستانیوں کو ہمارے جوانوں کی طرح جسمانی طور پر کسی مشکل یا سختی کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ چار دنوں میں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں لڑی گئی تھیں جن میں ہندوستانیوں کا جانی نقصان معمولی تھا۔ ان کی نفری، ان کا اسلحہ ایمونیشن، ان کا تر و تازہ اور ان کے لیے آرہے

ان کے پاس صحیح وسلامت موجود تھے اور ان کے مورچے بھی پختہ اور ہر لحاظ سے اچھے تھے۔
ان پر مشکل یہ آن پڑی تھی کہ ان پر ہمارا حملہ اور ہمارے دستوں کا پانڈو تک صرف پہنچ
جانا کوئی غیر متوقع تھا اور انہیں اب پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آگے کیا ہو جائے گا۔
ایک انجانا سا خوف ان کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا جس نے ان میں لڑنے کے جو بچے
کچھ جذبے کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ وہ اس خدشے میں دبے ہوئے تھے کہ ان پر طوفان آنے
والا ہے جس کا نتیجہ انہیں معلوم ہو کر رہا تھا۔ انہیں گھیرے میں سے نکل جانے کا راستہ
نظر آ رہا تھا اور وہ بھاگ جانے کا موقع گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے کمانڈر نے کمانڈنٹ
کروا دیا اور یہ سارے کے سارے سوار پارٹی کے پیچھے اور گھنے جنگل میں چھپتے چھپاتے ہندوستانی
پانڈو سے نکل گئے۔ جب ہمارے دستوں نے پانڈو پر حملہ کیا تو دیکھا کہ وہاں کوئی ہندوستانی
نہیں ہے۔

لیکن پانڈو کا قصہ یہیں پر تمام نہ ہوا۔ مجھے جب اطلاع ملی کہ ہندوستانی پیچھے ہٹ گئے
ہیں تو میں نے ان کے تعاقب میں قبائلی پٹھانوں کا تیسرا لشکر بھیج دیا۔ پانڈو کے گرد و نواح میں
جو قبائلی تھے وہ بھی اس لشکر سے مل کر دشمن کے تعاقب میں چلے گئے۔ ہندوستانی ڈری
ہوئی بھیڑوں کی طرح پہاڑی سے اترتے گھنے جنگل میں بھاگے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ جنگل
انہیں پناہ میں لے گا لیکن قبائلی ان پر بھیڑیوں کی طرح جا پڑے۔ ہندوستانی اگر پانڈو
کے دفاعی مورچوں میں رہتے تو ان کا یہ حشر نہ ہوتا جو مورچوں سے بھاگ کر ہوا۔ قبائلیوں نے
جو بھی گھنٹے ان کا شکار زیادہ تر خنجروں سے کیا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ جو ہندوستانی افسر
اور جوان مارے گئے ان کی صحیح تعداد کیا تھی۔ جو کچھ بھی تھی یہ تعداد تین سو سے کم نہیں تھی۔
جب قبائلی واپس آئے تو ان میں سے بیشتر ہندوستانی وردی پہنے ہوئے تھے اور
وہ اپنے ساتھ بے اندازہ اسلحہ ایمونیشن اور دیگر سامان لائے تھے۔

تقریباً ایک سو تیس رائفلیں بمعہ ایمونیشن تھیں۔ تقریباً اڑھائی لاکھ راؤنڈ ایمونیشن
بکسوں میں بند تھا۔ دو ہیوی مارٹر گنیں، چودہ دو انچ مارٹر گنیں اور ایک مشین گن تھی۔
مارٹر گنوں اور توپوں کے تقریباً ایک ہزار گولے اور راشن کا جو ذخیرہ پٹھان اٹھا لائے تھے
وہ خاصا زیادہ تھا۔

پانڈو ہمارے ہاتھ لگ جانے سے ہندوستانیوں کے باقی دفاعی مورچے ناکامی کے

گھروندے کی طرح ڈھیر ہو گئے۔ جنگ کی چوٹی پر جس کی بلندی ساڑھے دس ہزار فٹ تھی، ہندوستانیوں کی دو کمپنیاں مورچہ بند تھیں۔ جونہی ہم نے ان پر توپ خانے کا فائر کھولا وہ دونوں کمپنیاں پہاڑی چھوڑ کر پسپا ہو گئیں۔ ان کا تعاقب آزاد کشمیریوں اور سکاؤٹس نے کیا۔ اس کے بعد اجتماعی پیشقدمی شروع ہوئی۔ آگے دس ہزار فٹ بلند چھوٹا تاماتی ناگ تھا۔ یہ اس سلسلۂ کوہ کی بلند ترین پہاڑی تھی۔ اس کی جنگی اہمیت یہ تھی کہ بارہمولا سے اوڑی تک ہندوستانیوں کی جو سپلائی لائن تھی، تاماتی ناگ کی بلندی اس پر غالب آجاتی تھی۔ ہمارے دستے پیشقدمی کرتے ہوئے اس اہم پہاڑی سے صرف دو سو گز دور رہ گئے تھے کہ جی۔ایچ۔کیو سے حکم آگیا کہ ہم اور آگے نہ بڑھیں۔

ہم ناگ کی سیدھ میں صرف چند میل آگے بڑھے تھے لیکن ہمارے قبضے میں نوسے مربع میل علاقہ آگیا تھا —— تاہم پانڈو کی کہانی ایک بہادر انسان، صوبیدار کالا خان شہید کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ وہ وہیں ایک سبزہ زار میں دفن ہے۔ وہ چھاپہ مار پارٹیوں کے ساتھ تھا۔ گزشتہ مہینے کے دوران اس نے جو دلیرانہ چھاپے اور شب خون مارے تھے اور جس طرح اس نے دشمن کی مورچہ بندیوں میں کھلبلی مچائی تھی اس سے ہمارا پلہ بھاری ہو گیا تھا۔ پانڈو پر حملے کے دوران وہ شہید ہو گیا تھا۔

وہ تو زندگی میں ہی ایک روایت بن گیا تھا۔ شہادت کے بعد بھی لوگ اسے زندہ سمجھتے رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کی روح اس کی شکل اور اس کے اسی لباس میں جو وہ پہنا کرتا تھا، اس علاقے میں کئی بار نظر آئی۔ کئی لوگ جو اس علاقے میں اجنبی تھے کالا خان شہید کو زندہ سمجھتے رہے۔ کالا خان نے انہیں خوش آمدید کہا اور انہیں تفصیلاً سنایا کہ پانڈو پر کس طرح قبضہ کیا گیا تھا۔

یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ قبائلی کس قدر کارآمد ثابت ہوئے اور وہ کتنے کام کے لوگ ہیں۔ یہ رائے عام طور پر دی جاتی رہی ہے کہ فوجی نقطۂ نگاہ سے کشمیر میں پٹھانوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ یہاں تک بھی کہا گیا کہ وہ الٹا بوجھ بنے رہے۔ میں اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جب بھی فوج، آزاد کشمیریوں اور قبائلیوں کو اکٹھے اچھی طرح استعمال کیا تو یہ حیران کن حد تک نہایت کارآمد اجتماع ثابت ہوا۔ فوج ایک مرکزی مورچہ بندی قائم کر لیتی تھی۔ اس کے ارد گرد آزاد کشمیر کے مجاہدین علاقے

سے واقف ہونے کی وجہ سے اور تیز رفتاری کی بدولت ایک وسیع دفاعی سکرین بنا دیتے تھے جو تحفظ دینے کے علاوہ کمانڈر کے لیے آنکھ اور کان کا کام کرتی تھی۔ اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، قبائلی چھاپے اور شب خون مارتے اور گھات لگا کر دشمن پر ناگہانی طور پر جھپٹتے تھے۔ اس سے وہ اتنے وسیع علاقے کو اپنی زد میں لے لیتے تھے جس کے لیے ان کی تعداد بہت ہی کم ہوتی تھی۔ وہ دشمن کے علاقے میں اور اندر جا کر بھی حملے کرتے تھے۔ باقاعدہ فوج سے ایسی کارروائیوں کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

ابتدا میں قبائلیوں کو بہت سے ناخوشگوار واقعات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کا کوئی لیڈر نہیں تھا اور دوسری وجہ یہ کہ جب فوجی افسر محاذ پر آئے تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ قبائلیوں کو کس طرح استعمال اور کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ہمارے لیے بالکل قدرتی تھا کہ ہم آزاد کشمیر کے مجاہدین اور قبائلیوں سے توقع رکھتے تھے کہ ان کے طور طریقے اور ڈسپلن باقاعدہ فوج کی طرح ہو۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

جنگ کے آخر میں ہم میں سے کچھ افسروں نے پٹھانوں کے ساتھ وہی سلوک اور برتاؤ شروع کر دیا تھا جس کی پٹھان توقع رکھتے تھے۔ ہمیں اپنے جنگی علم اور تجربے کو استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا اس لیے ہم کوئی تکنیک اختیار نہ کر سکے۔ اگر جنگ جاری رہتی تو ہمیں یہ موقع مل سکتا تھا۔ اب تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ اگر آزاد کشمیریوں اور قبائلیوں کو دو دو سو میل لمبے پہاڑی ترنگ کی وادیوں اور جنگلوں میں اور چوٹیوں پر مضبوط مورچہ بندیوں کے ارد گرد بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا تو آئندہ چند مہینوں میں صورت حال کیا ہوتی۔ دو سو میل ترنگ کی وادیوں اور جنگلوں میں انہیں کوئی بھی روک نہ سکتا۔

تیرھواں باب

انڈین ائیر فورس

جنگ کا تمام عرصہ میں جس عنصر نے دشمن کو سب سے زیادہ فائدہ دیا وہ اس کا فضائی بیڑہ تھا۔ ہمارے پاس کوئی طیارہ تھا نہ کوئی طیارہ شکن گن، اس لیے انڈین ایئر فورس بے خوف و خطر اپنی مرضی سے سارے علاقے پر جہاں چاہے اور جب چاہے اڑتی تھی۔ کشمیر میں کوئی بھی جگہ ہندوستانی طیاروں سے محفوظ نہیں تھی۔ ہماری ٹرانسپورٹ صرف رات کے وقت چل سکتی تھی، ہماری دیگر سرگرمیاں اور نقل و حرکت بھی رات کی تاریکی میں ہوتی تھی۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں، چناری میں مجھے پہلی دو طیارہ شکن گنیں ملی تھیں۔ یہ چالیس ملی میٹر دہانے کی بوفرز قسم کی تھیں۔ یہ دو پونڈ کا گولا فائر کرتی تھیں اور ان کا رینج بہت کم تھا۔ یہ وزنی اور بے ڈھب تھیں۔ اس لیے انہیں صرف بڑی سڑک کے قریب نصب کیا جا سکتا تھا۔ اور اس علاقے میں بڑی سڑک تین ہزار فٹ بلندی پر تھی۔ سڑک کے دونوں طرف عمودی پہاڑیاں تھیں جن کی بلندی سات سے دس ہزار فٹ تک تھی۔ ان کی وجہ سے نظر محدود رہتی تھی۔ طیارے ان گنوں کے رینج میں صرف چند لمحوں کے لیے آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم ان گنوں سے ایک بھی طیارہ نہ گرا سکے۔ حوصلہ بلند اور لڑنے کے جذبے کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ جوابی وار کارگر ہو اور جوابی ضرب جو لگائی جائے کاری ہو۔ اس مقصد کے لیے میں نے دشمن کے طیارے گرانے کے لیے گھات لگانے کا بندوبست کیا۔ اس کی وضاحت کے لیے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

میری سکیم یہ تھی کہ دشمن کو یہ تاثر دیا جائے کہ ہماری طرف سے اس پر ایک خاص مقام پر حملہ ہونے والا ہے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اس علاقے میں اپنے طیارے بھیجے۔ میں نے جس مقام کا انتخاب کیا اس کے قریب اونچی پہاڑیاں تھیں جن کی چوٹیوں پر میں نے زمینی مشین گنیں لگوا دیں۔ میں نے بلوکھی کی پہاڑی کے نیچے، سب سے اگلی پوزیشن میں توپ خانے کی ایک میڈیم توپ لگا دی۔ میڈیم کا گولا سو پونڈ کا تھا اور سب سے بڑی توپ تھی جو صرف ہمارے پاس تھی دشمن کے پاس نہیں تھی۔ بلوکھی سے اوڑی کیمپ (جو دشمن کا تھا) ہماری توپ کے انتہائی رینج میں آ جاتا تھا۔ ابھی تک اس توپ کا گولا اس کیمپ تک نہیں گیا تھا۔ ہندوستانیوں کو یقین تھا کہ ہم وہاں تک گولا نہیں پہنچا سکتے۔ اسی لیے اوڑی کیمپ میں انہوں نے اپنے خیمے کھلے میدان میں لگا رکھے تھے اور ان کی ٹرانسپورٹ بھی کھلے میدان میں رہتی تھی۔ انہیں ہماری طرف سے نہ ہوائی بمباری کا خطرہ تھا نہ توپ خانے کی گولہ باری کا۔

میں نے اپنی اس سکیم کے لیے اسی گولے بچا کے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ ان سے میں دشمن کو بھاری نقصان پہنچا سکوں گا۔ گولہ باری سے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ہم اس کے ساتھ ہی حملہ کریں گے۔ حملے سے پہلے گولہ باری ضرور کی جاتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جونہی گولہ باری شروع ہوگی، ہندوستانی اپنے طیارے کو بلائیں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ طیارے کونسی سمت سے آتے ہیں۔ مجھے ان کے راستے کا بھی پتہ تھا۔ میں ان کے معمول سے آگاہ تھا۔ میں نے اس راستے کے قریب ان کے استقبال کے لیے ہر طرف نو ہزار فٹ چوٹیوں پر بارہ گنیں لگا رکھی تھیں اور سولہ برین گنیں لگا دی تھیں۔ میں نے گنروں کو اطلاع دینے کا ایک خصوصی طریقہ اختیار کیا تھا اور سارے بریگیڈ کو حکم دے دیا تھا کہ طیارے جس کی زد میں آئیں وہ ان پر فائر کرے۔

گولہ باری کرانے کے لیے میں نے توپ خانے کے ایک افسر کو پانڈو کی نو ہزار تین سو فٹ بلند چوٹی پر بھیج دیا تھا جہاں سے اسے اوڑی کیمپ نظر آتا تھا۔ یہ اہتمام مکمل کر کے ہم ایسے لمحے کا انتظار کرنے لگے جب موسم اچھا ہو اور مطلع ابر آلود نہ ہو کہ

ہندوستان کے طیارے آ نکلیں۔ دوپہر کے وقت آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ میں
نے اپنی میڈیم توپ کو گولہ باری کا حکم دے دیا۔ پانڈو کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے توپخانے
کے افسر نے فائر آرڈر دے کر گولہ باری شروع کرا دی۔ گولے لوڑی کیمپ میں جا
پھٹے۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ گولہ باری اتنی غیر متوقع اور حیرت انگیز تھی کہ ان کے
کیمپ میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنے دستوں کی اس طرح نقل و
حرکت کی جس سے دشمن یہ سمجھا کہ ہم اس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ دشمن کے سگنل
سسٹم میں واویلا بپا ہو گیا۔ دشمن کو چونکہ یقین تھا کہ لوڑی کیمپ پر ہم گولے پھینک ہی
نہیں سکتے۔ اس لیے اس نے گولہ باری سے بچنے کے لیے حفاظتی اقدام بھی کیا
ہی نہیں تھا۔

ایک گھنٹے کے اندر ایک ہندوستانی طیارہ آ گیا۔ وہ ہمارے توپ خانے کو تباہ کرنے
آیا تھا، لیکن وہ پچاری پر ہی اڑتا رہا اور وہیں آگ برساتا رہا۔ وہاں ہماری پرانی گن پوزیشن
تھی۔ ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ ہمارا توپ خانہ اب بھی وہیں ہے لیکن وہاں کوئی
توپ نہیں تھی۔ ہم نے وہاں ہندوستانی طیاروں کو مارنے کا بھی کوئی اہتمام نہیں کیا تھا۔
یہ طیارہ وہیں ایمونیشن ضائع کر کے چلا گیا۔ پھر سورج غروب ہو گیا۔ اب ہماری سکیم لیک
نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ رات کو طیارے نہیں اڑتے تھے۔

صبح ہوتے ہی دشمن کے تین طیارے آ گئے۔ وہ پانڈو پر ہوائی حملے کے لیے
آئے تھے۔ ہم نے ان کے استقبال کا بندوبست کر رکھا تھا۔ تمام بریگیڈ کو قبل از
وقت خبردار کر دیا گیا اور ہر کوئی تیار ہو گیا ـــــ طیاروں نے پانڈو کے اوپر آ کر چکر لگایا
پھر ایک دوسرے کے پیچھے غوطے میں آ گئے۔ ان کے ہوا باز بے خوف و خطر چلے
آ رہے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان پر ہوائی فائر کرنے کے لیے کوئی مشین گن نہیں ہے۔
نہ کبھی کسی مشین گن نے ان پر فائر کیا تھا۔

پہلا طیارہ غوطے میں آتے ہوئے جب ہماری ان مشین گنوں کے رینج میں آیا جو
ہم نے چوٹیوں پر چھپا رکھی تھیں تو چاروں طرف سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑیں برسنے
لگیں۔ طیارہ غوطے سے اٹھ نہ سکا اور پچھلی سے آگے زمین سے جا ٹکرایا اور اس
کے پرخچے اڑ گئے۔ دوسرا طیارہ اس کے بالکل پیچھے ساتھ لگا ہوا غوطے میں آ رہا تھا۔

اس میں سے بھی دھواں نکلنے لگا اور وہ بھی زمین کی طرف جانے لگا۔ ان دونوں طیاروں میں سے ایک کے ہوا باز کو پیراشوٹ سے اُترتے دیکھا گیا۔ اس کے بعد دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ دونوں طیارے تباہ ہو گئے ہیں لیکن یہ علم نہ ہو سکا کہ جو ہوا باز پیراشوٹ سے اُترا وہ اگلے طیارے سے نکلا تھا یا دوسرے سے۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے طیارے کا ہوا باز تھا لیکن ہمارے جوانوں نے ایک اور ہی کہانی سنائی۔ وہ کہتے تھے کہ صرف پہلے طیارے کو گولیاں لگی تھیں۔ دوسرا بچ گیا۔ لیکن اس دوسرے طیارے کا ہوا باز سکھ تھا۔ اس نے اگلے طیارے کو دیکھا کہ مشین گنوں کی زد میں آگیا ہے اور اس کا ہوا باز اس سے کود نہیں رہا تو سکھ ہوا باز اپنے اچھے بھلے طیارے میں سے کود گیا ـــــ ہو سکتا ہے جوانوں کی یہ کہانی محض من گھڑت ہو لیکن محاذ پر اسی کہانی کو صحیح تسلیم کیا گیا۔

چودھواں باب

پونچھ کا محاصرہ ٹوٹ گیا

ہندوستانیوں کا مظفر آباد کی سمت موسم گرما کا حملہ ناکام ہو گیا تو انہوں نے پونچھ کا محاصرہ توڑنے کے لیے جموں سے مغرب اور شمال کی طرف حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پونچھ ہمارے محاصرے میں تھا۔ پونچھ سیکٹر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن میں فائر بندی تک کی صورت حال کو واضح کرنے کے لیے پونچھ کا ذکر مختصراً کروں گا۔

جموں سے مغرب کی طرف ایک کچی سڑک نوشہرہ سے آگے تک جاتی تھی۔ یہ سڑک پاکستان کی سرحد کے تقریباً متوازی چند ہی میل دور سے جنوب کی طرف تھی۔ نومبر ۱۹۴۷ میں ہندوستان کے ایک بریگیڈ نے یہاں پیش قدمی کی تھی۔ آزاد کشمیری اسے روک نہیں سکے تھے۔ چنانچہ یہ بریگیڈ نوشہرہ پہنچ کر ریاست کی فوج سے جا ملا تھا۔ وہاں ہندوستانیوں نے میرپور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرپور نوشہرہ کے مغرب میں منگلا ہیڈورکس کے قریب واقع تھا جہاں سے جہلم نہر نکلتی تھی۔ ہندوستانیوں کی یہ کوشش ناکام ہو گئی تھی اور انہیں نوشہرہ کے گرد و نواح میں روک لیا گیا تھا۔ اسی وقت شمال مغرب میں کچھ فاصلے پر کوٹلی کے مسلمانوں نے ریاست کی فوج پر قابو پالیا اور کوٹلی پر قبضہ کر لیا تھا۔

اس کے بعد اگست ۱۹۴۸ء تک اس علاقے میں صورت حال یہی رہی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ہندوستانیوں کا قبضہ نوشہرہ اور اس کے عقب میں سڑک تک محدود رہا اور آزاد کشمیری سڑک کے دونوں طرف کے علاقوں پر قابض رہے۔

یہاں سے آگے شمال کی جانب پونچھ واقع ہے۔ یہ پونچھ جاگیر کے حکمران کا علاقہ

تھا۔ پونچھ جاگیر کی آبادی میں تین لاکھ بیاسی ہزار مسلمان تھے جو پنجابی بولتے تھے اور تقریباً انتالیس ہزار غیر مسلم تھے۔ اس آبادی میں کم و بیش اسی ہزار جوان گزشتہ جنگِ عظیم میں برطانوی ہند کی فوج میں بھرتی ہوئے اور جنگ میں لڑے تھے

اس علاقے کے لوگ اب پہنچتے تھے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ریاست کی جو فوج اگیر دن پونچھ میں تھی اس سے ہتھیار ڈلوا لیے اور علاقے کو ریاستی فوج سے صاف کر دیا۔ یہ کامیابی انہوں نے جنگِ آزادی کے پہلے ہی چند ہفتوں میں حاصل کر لی تھی لیکن وہ پونچھ شہر پر قبضہ نہیں کر سکے تھے۔ بلکہ اسے محاصرے میں لے لیا تھا۔

ریاست کی بھاگی ہوئی فوج اور غیر مسلم ادھر ادھر سے بھاگ کر پونچھ شہر میں چلے گئے تھے۔ جونہی مہاراجہ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا، ہندوستانیوں نے شہر میں کمک بھیج دی۔ اس کے بعد یہ سڑک بند رہی۔ ہندوستانی شہر کو طیاروں کے ذریعے سپلائی بھیجتے تھے۔

مئی ۱۹۴۸ء میں جب ہندوستانیوں نے اوڑی سے موسم گرما کا حملہ شروع کیا تھا تو ان کا مقصد یہی تھا کہ اصل مقصود کے بعد پونچھ کا محاصرہ توڑا جائے لیکن ان کا حملہ ناکام ہو گیا۔ اس سے ہم نے یہ فائدہ اٹھایا کہ اوڑی پونچھ روڈ کو ہر وقت بند رکھا۔ لہٰذا جولائی ۱۹۴۸ء کے آخر میں پانڈو فتح کر لینے کے بعد اس علاقے میں جمود طاری رہا۔ پونچھ ہمارے محاصرے میں باقی کشمیر سے کٹا رہا۔

اگست ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ نے فائر بندی کی تجویز کو آخری شکل دے دی۔ ۱۳ اگست کے روز یہ تجویز دونوں حکومتوں کے آگے رکھ دی گئی۔ دو ہفتے بعد دونوں فریق نے اس تجویز کو اس شکل میں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ترمیمیں اور مشورے پیش ہونے لگے۔ یہ حقیقت نمایاں طور پر نظر آنے لگی کہ جلدی یا کچھ دیر بعد فائر بندی ہو جائے گی۔

غالباً اس وقت ہندوستان کو پونچھ کی پوزیشن کا فکر کھائے جا رہا تھا۔ اگر فائر بندی اس حال میں ہو جاتی کہ پونچھ آزاد کشمیر کے محاصرے میں رہ جاتا تو شہر سارے کشمیر

سے کٹ رہ جاتا اور اس کے اندر محصور ہندوستانی فوج اور غیر مسلم شہری آزاد کشمیر والوں کے پاس یرغمال بنے رہ جاتے۔ یہ یرغمال ہندوستان کی ایک کمزوری بن جاتی اور اگر ہندوستان کشمیر میں رائے شماری میں تاخیر کرتا یا ہٹ دھرمی کرتا تو کشمیری پونچھ کے یرغمال کو اس کے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔ ہمارا مدعا یہی تھا کہ کشمیر میں غیر جانبدارانہ رائے شماری کرائی جائے۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ رائے شماری کا نتیجہ کیا ہوگا۔ مگر ہندوستان کا مدعا یہ تھا کہ رائے شماری جلدی نہ کرائی جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کو اپنے حق میں کرنے کا وقت حاصل کیا جائے۔ لہٰذا رائے شماری میں تاخیر اس کے حق میں جاتی تھی۔ لیکن پونچھ کو اس عرصے کے لیے ہمارے قبضہ میں یرغمال کے طور پر رہنے دینا بھی ہندوستان کے لیے دانشمندانہ اقدام نہیں تھا۔ لہٰذا ہندوستان نے پونچھ کا محاصرہ فائر بندی سے پہلے پہلے توڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

حالانکہ ہندوستان اور پاکستان نے اقوام متحدہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فائر بندی کی تجاویز قبول ہونے تک صورت حال کو زیادہ بگڑنے نہیں دیں گے۔

ہم پونچھ کھو بیٹھے ——— کیوں؟

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میں نے اپنی آنکھوں نہیں دیکھا۔ میں اس سے متعلق رہا۔ لہٰذا میں اُن خبروں کا حوالہ دوں گا جو اس وقت اخبارات میں چھپتی رہیں۔ وہ علاقہ جہاں چند مہینوں سے سکوت طاری تھا، سرگرم ہوگیا جیسے ہلچل مچ گئی ہو۔ ۲۳ اگست ۱۹۴۸ کے روز خبر ملی کہ ہندوستانی نوشہرہ سیکٹر میں کئی جگہوں پر فوج جمع اور تیار کر رہے ہیں۔ ایک ماہ بعد ۵ ستمبر ۱۹۴۸ کے روز یہ خبر ملی کہ نوشہرہ کے شمال میں ہندوستانی راجوری سیکٹر کو کمک دے رہے ہیں۔ وہاں چند ایک جھڑپیں بھی ہوئیں۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۸ کے روز ہندوستانیوں نے راجوری کے شمال مشرق میں خاصی بڑی فورس سے حملہ کیا جو پسپا کر دیا گیا۔ دو روز بعد اسی جگہ چند اور معرکے لڑے گئے۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ کے روز راجوری کے مقام پر شدید لڑائی ہوئی۔ دشمن کی نفری پورا ایک بریگیڈ تھا۔

اسی روز نوشہرہ کے شمال مغرب میں جہاں دشمن کی کمک آ رہی تھی، لڑائی ہوئی۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے روز ہندوستان کی پونچھ والی بریگیڈ بھی سرگرم ہو گئی۔ چار روز بعد آزاد کشمیر کے صدر، سردار ابراہیم نے پاکستان کے لوگوں سے ان الفاظ میں اپیل کی ؎ "ہم نے بے حد دشوار حالات اور مشکلات میں جنگِ آزادی جاری رکھی ہے۔ مگر یہ امکان نظر آنے لگا کہ پاکستان کے لوگوں نے آزاد کشمیر کے مجاہدین کو خاطر زندہ و رکھنے کے لیے راشن، کپڑوں اور دیگر ضروریات کی مدد نہ دی اور یہ مدد جاری نہ رکھی تو جنگِ آزادی جاری نہیں رکھی جا سکے گی۔"

۲ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز اخباروں میں خبریں چھپیں کہ اس سیکٹر میں دشمن نے کئی مقامات سے پیشقدمی کی ہے۔ ۳ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز آزاد کشمیریوں نے راجوڑی چنگاس روڈ پر رکاوٹیں کھڑی کر کے دشمن کی پیش قدمی روک دی۔ کھتوگل اور پریما کے مقامات پر بھی جھڑپوں کی خبریں ملیں۔ ۵ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز راجوڑی کے شمال میں معرکہ لڑا گیا۔ ۸ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز ہندوستانی راجوڑی کے شمال مغرب میں نمودار ہوئے۔ ۱۱ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز ہندوستانی ٹینک بھی محاذ پر آ گئے۔ ۱۳ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز دشمن نے مزید حملے کیے۔ ۱۵ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز دشمن کی مزید کمک آ گئی۔

۱۸ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز اخباروں میں یہ سرخیاں دیکھی گئیں ——— "ہندوستان کشمیر میں بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہے" ——— "جموں میں ہندوستان نے دو بریگیڈ اور ایک توپ خانہ رجمنٹ کی کمک بھیج دی" ——— ریاستی پونچھ کے علاقے میں دشمن کے تین ڈویژن سرگرم تھے جن کا ہیڈ کوارٹر نوشہرہ میں تھا۔ یہ خبر بھی ملی کہ ہندوستان نے راجوڑی سے کوٹلی اور میندھر کی طرف ایک بڑا حملہ شروع کر دیا ہے۔

۲۰ نومبر ۱۹۴۸ء کے روز میندھر وادی میں خونریز لڑائی ہوئی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پونچھ کی محصور فوج نے محاصرہ توڑنے کی کوشش کی۔ یہ اس لڑائی کا عروج تھا۔ ایک دو دن بعد پونچھ کا محاصرہ ٹوٹ گیا اور ہندوستانیوں نے نوشہرہ اور پونچھ کو ملا دیا۔ اس سے ہم اس لائن کے مشرق کا تمام علاقہ کھو بیٹھے۔ تحصیل میندھر بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ چند دنوں بعد اٹھائیس ہزار پناہ گزین جہلم (پاکستان) پہنچے اور

ابھی تیار کر رہے تھے۔

یہ سب سے بڑا نقصان تھا جو جنگ میں ہمیں اٹھانا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس محاذ کو لنگ ذرے دی ہی کوئی ایسا پلان تھا جس کے تحت اسی سے مزاحمت کرتے جو کچھ چھوٹے سے وہاں موجود تھا۔ ہندوستانیوں نے جو حملہ کیا تھا اس کی تیاریوں اور اجتماع میں انہوں نے بہت وقت صرف کیا تھا۔ اس کے متعلق پاکستانی گورنمنٹ کو بھی علم تھا۔ پاکستان آرمی کے جی ایچ کیو کو بھی علم تھا۔ پاکستان کے عوام کو بھی علم تھا۔ بریگیڈیئر اور بعد میں لیفٹیننٹ جنرل اختر خان جو اس سیکٹر کے کمانڈر تھے، وہ حکام بالا کو تفصیلی رپورٹیں بھیجتے رہتے تھے۔ مگر انہیں نہ تو کمک کے طور پر کوئی فوج دی گئی نہ انہیں ہدایات دی گئیں کہ وہ کیا کریں۔

اس قسم کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے لازمی تھا کہ جو صورت حال بنتی چلی جا رہی تھی اس کا گہرا جائزہ لیا جاتا۔ یہ بھی لازمی تھا کہ دشمن کے عزائم اور اس کی نقل و حرکت کو قبل از وقت سمجھا جاتا۔ یہ جائزہ، قیاس آرائی اور پیش بندی فوجی کاروائی اور میدان جنگ کا ایک عام سا اصول ہے جسے کوئی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میدان جنگ میں فوجوں کے فیصلے ایسے ہی جائزوں اور قیاس آرائیوں کی روشنی میں کیے جاتے ہیں۔ اگر کشمیر محاذ پر حکام بالا اگلے مورچوں کی رپورٹوں کے مطابق صورت حال کا جائزہ لے لیتے اور فیصلہ کر لیتے کہ خطرہ جو آ رہا ہے اس کے مقابلے کے لیے کتنی قوت بھیجی جائے اور کون سا علاقہ یا علاقے لڑے بغیر چھوڑ دیے جائیں تو صورت حال مختلف ہوتی۔ ایسے فیصلے مقامی کمانڈروں پر نہ چھوڑے جاتے۔ ایسے فیصلے حکومت کو خود کرنے تھے اور یہ حکومت کی سطح کا ہی کام تھا۔

دشمن نے ہم پر بے خبری میں حملہ نہیں کیا تھا۔ ہم باخبر تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ہندوستانی پونچھ کا محاصرہ توڑنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار کوشش کر چکے تھے اور جب اگست ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی طرف سے فائر بندی کی تجاویز آئیں تو یہ عقلی طور پر واضح تھا کہ ہندوستانی فائر بندی کے وقت تک پونچھ ہمارے قبضے میں نہیں رہنے دے گا۔ پھر انہوں نے حملے کی تیاریوں میں اتنا زیادہ وقت صرف کیا۔ اس حملے کو جو فاصلہ طے کرنا تھا وہ ایک سو میل سے زیادہ تھا۔ ہمارے پاس خاصا وقت تھا کہ ہم اس کے مقابلے کی تیاری کر لیتے۔

بعد میں یہ جواز پیش کیا گیا تھا کہ ہمارے پاس کشمیر میں بھیجنے کے لیے فوج نہیں تھی۔ اس کے باوجود دو ہفتے بعد جب عوام نے اس جواز پر حیرت کا اظہار اخباروں کے ذریعے کیا تو ہم نے آزاد کشمیریوں، قبائلیوں اور باقاعدہ فوج کی پوزیشنوں کی ایک ملی جلی فوج اکٹھی کر لی جس کی نفری پچیس ہزار تھی۔ اس فوج کے پاس پاکستان آرمی کے توپخانے کی پچاس توپیں بھی تھیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اس فوج کا کچھ ہی حصہ ذرا پہلے آگے بھیج دیا جاتا تو ہندوستان پونچھ اور نوشہرہ کو بچا نہیں سکتا تھا۔ بہت سے پلان بنانے اور تیاریاں کرنے کے بعد اس فورس کو آگے بھیجا گیا۔ اس نے جموں سے پونچھ تک دشمن کی طویل رابطہ لائن درمیان سے توڑ دی۔ دشمن کی خاصی بڑی فورس جو نوشہرہ سے آگے تھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

پھر ایک۔ ہیں دسمبر کے پہلے ہفتے میں ہمارے توپخانے نے گولہ باری شروع کی اور پانچ ہزار گولے فائر کر دیے مگر کوئی حملہ نہ کیا۔ اگر اتنی زیادہ گولہ باری کے فوراً بعد شدید قسم کا حملہ یعنی جس میں زیادہ نفری ہوتی، کر دیا جاتا تو ہندوستانیوں کو جموں سے کاٹ دیا جاتا جو ان کا بڑا اڈہ تھا۔ حملہ نہ کرنے کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ ایسے حملے سے جنگ ختم نہیں کی جا سکتی تھی یعنی جنگ اور طویل ہو جاتی۔ اور ہندوستان کو ہمارے حملے سے جو بھاری نقصان ہوتا وہ اسے مجبور کر دیتا کہ وہ پاکستان پر حملہ کر دے ـــــ اگر یہی جواز تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حکام بالا دو ہفتے پلان بناتے اور حملے کی تیاریاں کرتے رہے تو اس دوران انہیں خیال نہیں آیا تھا کہ ہندوستان پاکستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے گا؟ یہ خیال اس وقت کیوں آیا جب ہمارے توپخانے نے گولہ باری شروع کر دی تھی؟ ـــــ آخر پانچ ہزار قیمتی گولے ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

ہمارے حملہ نہ کرنے سے ہندوستانیوں کو یہ خطرہ تو نہ رہا کہ وہ جموں سے کٹ جائیں گے لیکن ہندوستانی چند اور خطروں میں آ گئے تھے۔ نوشہرہ سے آگے ایک سو میل لمبا ان کا سپلائی لنک ہمارے سامنے اور ہماری زد میں تھا۔ جو آنے والے دنوں میں ہمارے قبائلی اور آزاد کشمیری چھاپہ ماروں کے لیے گھات لگانے، چھاپے اور شبخون مارنے، دشمن کے کانوائے اور دستوں پر جھپٹنے کے لیے بہترین مواقع پیش کرتا تھا۔ ان چھاپہ مار کارروائیوں

سے ہندوستان کی اس فوج میں خون کا ایک قطرہ نہ رہنے دیا جاتا مگر ہندوستانیوں کی قسمت اچھی تھی کہ دسمبر کے آخر میں خانہ جنگی نے انہیں بچا لیا۔

کارگل
لداخ
سرینگر
پونچھ
ایبٹ آباد
راولپنڈی
سیالکوٹ
صفر
پچاس میل
فائر بندی لائن

پندرھواں باب

فائر بندی —

ہندوستان نے سب کچھ حاصل کر لیا

۳۱ دسمبر ۱۹۴۸ء نصف شب کے وقت دونوں فریقوں نے فائر بندی کا حکم دے دیا اور جنگ ختم ہو گئی۔ فائر بندی غیر متوقع یا اچانک نہیں تھی۔ چند مہینوں سے یہ عیاں ہوتا چلا جا رہا تھا کہ فائر بندی کرنی ہی پڑے گی اور یہ مسئلہ دوسرے ذرائع سے حل کیا جائے گا۔ آزاد کشمیر کے لوگوں نے یہ توقع کبھی بھی نہیں رکھی تھی کہ وہ ہندوستان کو طاقت سے کشمیر سے باہر نکال سکیں گے۔ ان کی خواہش اور منشا صرف یہ تھا کہ ان کے غیر جانبدارانہ رائے شماری کے حق اور دعوے کو تسلیم کیا جائے۔ اب ان کا یہ حق مسلم تھا۔ لہٰذا اب فائر بندی اصولاً بہتر تھی۔ تاہم ہم لوگ اس لائن کو تسلی بخش نہیں سمجھتے تھے جس پر فائر بندی ہوئی تھی کیونکہ اس سے ہندوستان کو وہ کچھ مل گیا جو وہ چاہتا تھا۔

اب کوئی ایسا علاقہ، کوئی پہاڑی یا کوئی ایسا اہم مقام نہیں رہ گیا تھا جس کی ہندوستان کو وادی، لداخ اور جموں کے تحفظ اور دفاع کے لیے ضرورت ہو۔ کشمیر کے ساتھ ہر طرح کا رابطہ قائم رکھنے کے لیے ہندوستان کے پاس کٹھوعہ روڈ تھی۔ اس کے علاوہ پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ ایک اور سڑک زیر تعمیر تھی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا مقام، ایسا نقطہ یا کوئی ایسا عنصر نہیں رہ گیا تھا جس سے ہم ہندوستان پر دباؤ ڈال سکتے اور اسے مجبور کر سکتے کہ رائے شماری میں تاخیر یا انکار نہ کرے۔ فائر بندی کے معاہدے میں بھی کوئی ایسی شق نہیں رکھی گئی تھی اور نہ ہی وقت کا تعین کیا گیا تھا کہ کتنے عرصے کے اندر رائے شماری ختم کرائی جائے۔ اقوام متحدہ نے تو خیر سگالی کے جذبے کے تحت ثالثی کر کے یہ معاہدہ کر

تھا۔ اقوام متحدہ نے کشمیر کے مسئلے کو اپنی ذمہ داری میں نہیں لیا تھا اور نہ ہی کوئی
ایسا وعدہ کیا تھا، تحریری طور پر لازم قرار دیا تھا کہ رائے شماری ضرور ہو گی۔

لہٰذا ہندوستان کے لیے جو ابھی موجود تھا اور انگشت نمائی کر رہا، اس مسئلے کو جوں کا
توں رہنے دے اور ہم ہندوستان کے محتاج رہیں کہ وہ فائر بندی کے معاہدے کا احترام
کرے نہ کرے۔ جیسا کہ ہمیں یقین تھا کہ کشمیر کے لوگ پاکستان کے حق میں ووٹ دیں گے
تو ہندوستان کے لیے رائے شماری کا مطلب یہ تھا کہ وہ کشمیر طشتری میں رکھ کر ہم کو پیش
کرے گا۔ عقل تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ ہندوستان نے ریاست کی ملکیت کے لیے جو شدید
جنگ لڑی تھی اس کے بعد وہ ہماری توقعات پوری کرے گا۔

رائے شماری کی توقع صرف اس صورت میں رکھی جا سکتی تھی جب کبھی دونوں ملک
کچھ دو کچھ لو کا جذبہ پیدا کر لیتے لیکن یہ ناممکن تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ کچھ دیا جائے اور
کچھ لیا جائے۔ اب ایسی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی جو ہندوستان لینا چاہتا تھا۔ وہ جونا گڑھ
اور حیدرآباد لینا چاہتا تھا۔ وہ دونوں پہلے ہی لے چکا تھا۔ لہٰذا ہمارے لیے فائر بندی کا
مطلب یہ تھا کہ ہم اپنے جھگڑے کو ایک امید تک گھسیٹ لے گئے تھے ——— امید
یہ تھی کہ قسمت کوئی غیر معمولی پلٹا کھائے گی یا ہندوستان غیر معمولی فیاضی کا مظاہرہ کرے گا۔
انہی احوال و کوائف کے پیش نظر میں نے کچھ وقت بعد، وزیر اعظم لیاقت علی خان کو
بتایا تھا کہ ہم نے اپنے آپ کو کس قدر نازک پوزیشن میں ڈال دیا ہے۔ اگر وزیر اعظم مجھ سے یا
کسی ایسے فرد سے مشورہ لیتے جو محاذ پر عملاً جنگ میں شریک تھا تو اسے بہتر مشورہ دیا جاتا۔ مجھے یہ علم حاصل نہیں تھا
کہ کس سے مشورہ لیا گیا لیکن میں چونکہ شروع سے ہی جنگ میں شریک تھا اور مجھے وہاں کے جغرافیائی
کوائف اور صورت حال کا علم زیادہ تھا اس لیے میری معلومات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

ہم سب جانتے تھے کہ فائر بندی ہوتی ہی ہے۔ لیکن یہ ایک مہینہ پہلے ہو جاتی تو پونچھ
ہمارے ہاتھ میں یرغمال کے طور پر رہتا۔ یا پونچھ کا محاصرہ ٹوٹ جانے کے بعد ایک دو مہینے تک
فائر بندی تسلیم نہ کی جاتی۔ اس عرصے میں ہم ہندوستان کے مقابلے میں کچھ فوائد حاصل
کر کے توازن قائم کر لیتے۔ مثلاً ہم ہندوستان کی اس سپلائی اور رابطہ لائن کو تباہ کر سکتے
تھے جو نوشہرہ سے شمال کی طرف جاتی تھی۔ ہم یقیناً اس پوزیشن میں تھے کہ پانڈو کے

سلسلہ کوہ سے چند میل بارہ مولا کی طرف پیش قدمی کر سکتے۔ اس سے ہمیں یہ کامیابی حاصل ہوتی کہ ہم آسانی سے بارہ مولا تک کی سڑک کو دشمن کے لیے غیر محفوظ کر دیتے اور ہم ریاست کی بجلی کی سپلائی لائن کے لیے مستقل خطرہ بنے رہتے۔

اب ایسی کارروائیوں کے مواقع ختم ہو گئے تھے۔ ہم فائر بندی کو توڑ نہیں سکتے تھے۔ اب تو یہ صورت پیدا ہو گئی کہ ہم جتنا زیادہ انتظار کرتے ہیں، ہندوستان کی پوزیشن اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے اب یہی ایک اقدام رہ گیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو اسلحہ اور روپیہ دیں اور ان کے حق میں پروپیگنڈہ کریں تاکہ وہ اٹھیں اور اپنی آزادی کے لیے لڑیں۔ ہم یہ مدد فوراً شروع کر سکتے تھے۔

تین ماہ بعد مجھے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بات چیت کے لیے بلایا جو دو گھنٹے جاری رہی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس نے کچھ اسلحہ فراہم کرنے کا انتظام کر لیا ہے اور چھ ماہ کے اندر اندر مقبوضہ کشمیر میں ہماری مدد پہنچنی شروع ہو جائے گی۔ اس کے بعد وزیر اعظم کے ساتھ متعدد بار ملاقات ہوئی لیکن ہر ملاقات مجھے اس سے دور ہی دور ہٹاتی گئی۔ کشمیر میں میرا تو کوئی سود و زیاں نہیں تھا۔ میری دلچسپی یہ تھی کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا کشمیر کا مسئلہ آسان نہیں بلکہ مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔ لیکن وزیر اعظم کا یہ خیال تھا کہ ہمارے لیے انتظار میں فائدہ ہے۔

لہٰذا چھ ماہ کا یہ عرصہ جس کے اندر اندر مقبوضہ کشمیر کو مدد بھیجنی تھی کبھی بھی ختم نہ ہوا۔ البتہ مجھے آخر کار جیل جانا پڑا۔ وزیر اعظم ایک قاتل کی گولی سے مارا گیا اور بیس سال گزر جانے کے بعد بھی مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو مدد نہ دی گئی جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو مدد کیوں نہ بھیجی گئی؟ ___ اس کے جواب میں بھی وہی پرانی دلیل دی گئی کہ ایسی مدد سے ہندوستان مشتعل ہو جائے گا۔ اور پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔ اور مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ حکومت پاکستان کو یہی مشورے دیے جا رہے ہیں کہ ایسا خطرہ مول نہ لینا۔

سولھواں باب

کشمیر کے آسیبی سائے —

پنڈی سازش کیس

فائر بندی کے بعد کشمیر کے آسیبی سائے بہت سے افراد پر ہی نہیں بلکہ سارے ملک پر پڑے۔ بہت سے اصحاب یہ محسوس کرنے لگے کہ ایسے امور کے متعلق جو کشمیر سے وابستہ نہیں تھے، ہماری پالیسیوں اور اقدامات کا محور ہی مسخ ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے نے ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر دیں — بائیس سال تک ہمارا آئین نہیں بن سکا۔ ہمارے پاس کوئی اقتصادی پروگرام نہیں ہے۔ خواندگی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور نہ ہی ہم کوئی ایسی بنیاد قائم کر سکے جس پر ہم دفاع میں خود کفیل ہو سکتے۔

فائر بندی کے چند ماہ بعد میں نے کشمیر میں اب کیا ہو گا کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ اب پنڈی سازش کیس کے کاغذات میں ہے۔ اس مقالے کا مقصد یہ تھا کہ میں واضح کر سکوں کہ فائر بندی کے معاہدے میں کوئی ایسی تحریر شامل نہیں کی گئی جو ہندوستان کو رائے شماری کرانے کی پابند کر سکے۔ اور اب اس میں تاخیر ہندوستان کے حق میں جا رہی ہے ہمارے حق میں نہیں۔ مگر بالائی حلقوں میں یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے سے پہلے ہمیں فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے وقت چاہیے۔ لیکن ایک عام ذہن کا انسان بھی سمجھ سکتا تھا کہ اس عرصے میں ہندوستان بھی اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرے گا اور اس کا اضافہ ہم سے کئی گنا زیادہ ہو گا۔

اس استدلال کے پس منظر میں دراصل وہی خدشہ کارفرما تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔ جہاں تک جنگ کا تعلق تھا، ہمارے ہاں کے بالائی حلقوں

میں فوجی طاقت کو ساز و سامان اور نفری سے ناپا جا رہا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ حقیقت آئی ہی نہیں تھی کہ اور بھی کئی عناصر ہیں جو فوجی طاقت میں شمار ہوتے ہیں اور اس وقت ایسے عناصر موجود تھے ——— میں نے مقالہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کو بھیج دیا۔ اُس نے مجھے راولپنڈی بلایا جہاں اس سے میری دو گھنٹے ملاقات رہی۔ میں یہ احساس لے کے واپس آیا کہ وزیر اعظم نے میرا نقطۂ نگاہ اور مدعا سمجھ لیا ہے اور اس کی اہمیت کو بھی قبول کر لیا ہے۔

لیکن مہینے گزر گئے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ اس دوران اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے بھی کچھ نہ کیا گیا۔ اس ضمن میں کچھ اقدامات تھے جو ہم کر سکتے تھے۔ شاید کہ ہم عوامی فوج تیار کر سکتے تھے جس کا طریقہ یہ تھا کہ نوجوانوں کو فوجی ٹریننگ دیتے اور ملک میں ہتھیار تیار کرتے اور انہیں بہتر بناتے ——— کچھ وقت پہلے، میں نے وزیر اعظم کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ دس لاکھ روپے کی رقم صرف کر کے شہروں کے چھوٹے چھوٹے کارخانوں اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ چھوٹا اسلحہ (رائفل، مشین گن وغیرہ) تیار کریں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صرف دو ہفتوں میں کچھ لوگ مشین گنیں اور ۳۰۳ کے راؤنڈ بنا کے لے آئے۔ میں نے ان ہتھیاروں کو متعلقہ محکمے سے ٹیسٹ کرایا تو وہ معیار پر پورے اترے۔ مگر بعد میں میری غیر حاضری میں اس سکیم کو ترک کر دیا گیا۔ یہ اقدام اُس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس قربان علی خان کے مشورے پر کیا گیا تھا۔ اُس نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ ملک میں اس طرح اسلحہ بننے لگا تو پاکستان میں شہری امن کو خطرہ لاحق ہوگا اور لاقانونیت شروع ہو جائے گی۔

ایک سال بعد میں نے ایک اور مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "جہاد کشمیر میں معاملہ گرم رکھو" ——— یہ مقالہ بھی پنڈی سازش کیس کے کاغذات میں پڑا ہے جس میں نے اس میں مشورہ پیش کیا تھا کہ چونکہ ہم اقوام متحدہ کے مبصروں کی موجودگی میں فائر بندی کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے اس لیے ہمارے سامنے یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی مدد کریں تاکہ وہ بھارتی استبداد کے خلاف اپنی جنگ لڑ سکیں۔ اس پر بھی کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ اور جن کے پاس اقتدار تھا وہ بار بار اقوام متحدہ سے درخواستیں کر کر کے اپنا دل خوش کرتے رہے۔

یہ ہر کسی کو معلوم تھا کہ صورتِ حال میں تبدیلی آئی تو اقوامِ متحدہ کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔ فائر بندی کے معاہدے میں اقوامِ متحدہ نے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا تھا کہ اگر ہندوستان نے رائے شماری ٹھکرائی تو یہ عالمی ادارہ کوئی کارروائی کرے گا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اقوامِ متحدہ کے کرنے کے لیے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کشمیر کی فائر بندی نے جو صورتِ حال پیدا کی تھی، ہندوستان اس پر خوش اور مطمئن تھا۔ وہ جو چاہتا تھا وہ اس نے حاصل کر لیا تھا۔ پاکستان کی طرف سے ہندوستان کو کوئی خطرہ نہیں تھا اور چونکہ پاکستان مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو کوئی مدد نہیں دے رہا تھا اس لیے اس کو بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ لہٰذا اقوامِ متحدہ کے پاس دخل اندازی کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔

ان مسائل کے متعلق میرے جو نظریات تھے وہ کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ میں نے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھا تھا اور نہ ہی کچھ پوشیدہ رکھنے کی کوئی وجہ تھی۔ چنانچہ میرے لیے اب یہی مناسب تھا کہ فوج سے نکل جاؤں۔ میں نے دوبارہ ایسے ارادے کا اظہار کیا تھا مگر مجھے کہا گیا تھا کہ میں نے اس صورتِ حال میں جیسی کہ اُس وقت تھی، فوج چھوڑی تو مجھے غدار سمجھا جائے گا۔ مجھے دراصل جس خیال نے فوج سے استعفیٰ دینے سے روکے رکھا وہ یہ تھا کہ فوج سے نکل کر میں کشمیر کی نجات کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ قائدِ اعظم فوت ہو چکے تھے۔ وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کو مسئلے سے ہمدردی اور دلچسپی تھی جس کا اظہار وہ ہمیشہ کرتا رہا لیکن اس کے گرد مشیروں کا جو حلقہ تھا وہ احتیاط اور تاخیر کا قائل تھا۔ کوئی متفق پارلیمنٹ بھی نہیں تھی نہ ہی کوئی فعال حزبِ اختلاف تھا جس کے پاس میں یہ مسئلہ لے جاتا۔ چونکہ آئین کوئی نہیں تھا اس لیے انتخابات کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔ انتخابات ہی ایک ذریعہ ہوتے ہیں جن سے جمہوری ملکوں میں عوام اپنے مسائل اور نظریات سامنے لاتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۴۹ء میں مجھے ترقی دے کر میجر جنرل کا عہدہ دیا گیا اور مجھے جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی میں چیف آف جنرل سٹاف بنا دیا گیا۔ اُس وقت جنرل ایوب خان ڈپٹی کمانڈر انچیف تھا اور وہ چند ہفتوں بعد کمانڈر انچیف بننے والا تھا۔ میں نے اسے کھلے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ مجھے چیف آف سٹاف جو بنایا گیا ہے یہ تقرر مناسب نہیں کیونکہ کشمیر کے متعلق مجھے اپنی حکومت سے اختلافِ رائے ہے۔ ایوب خان نے کہا کہ میرا تقرر اسی

کے کہنے پر کیا گیا ہے اور مجھے قبول کر لینا چاہیے۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دو باتیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ ایک یہ کہ کشمیر کے مسئلے میں ہر مہینے کی تاخیر کشمیر کے تابوت میں ایک کیل کا اضافہ کر رہی ہے اور دوسرے یہ کہ نہ ہی ایوب خان اور نہ ہی حکومت پاکستان اسے روکنے کے لیے کچھ کر رہی ہے۔

کشمیر دور ہی دور ہوتا اور نظروں سے اوجھل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور ایوب خان اکثر و بیشتر یہی رٹ لگاتا تھا کہ پاکستان کو روس اور چین کی طرف سے خطرہ ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ دونوں ملک پاکستان کو زنبور (PINCER) کی طرح جکڑ لیں گے اور اخروٹ کی طرح توڑ دیں گے۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ خطرہ اُس کے دماغ میں کس نے ڈالا تھا۔ بہرحال ایوب خان کی یہ رٹ محض بے معنی اور ناقابل فہم تھی۔

جہاں تک روس کی توسیع پسندی کا تعلق ہے وہ خطرہ موجود تھا لیکن اس کا رخ ایران کی طرف تھا۔ روس کو بحیرۂ ہند میں داخل ہونے کے لیے ایران کی بندرگاہ کی ضرورت تھی اور روس یہ بھی چاہتا تھا کہ ایران کے تیل کے بے بہا ذخیروں سے مغربی طاقتوں کو محروم کر دیا جائے۔ اگر نقشہ دیکھیں تو روس کے ان عزائم کا راستہ وہ سرحد تھی جو ایران اور روس میں مشترک ہے۔ افغانستان کی طرح مغربی پاکستان تو اس کے راستے میں نہیں آتا تھا۔ اسی طرح مشرق میں چین کی توسیع پسندی قدرتی طور پر جنوب مشرق میں تھائی لینڈ اور برما کی طرف ہو سکتی تھی۔ اُدھر بھی یہی پوزیشن تھی کہ مشرقی پاکستان اس کے راستے میں نہیں آتا تھا۔

درحقیقت اس وقت جو کچھ ہو رہا تھا وہ یہ تھا کہ مغربی طاقتیں ہوائی اڈوں کا ایک ایسا حلقہ بنانا چاہتی تھیں جہاں سے روس اور چین کے اندر کے علاقوں کو زد میں لیا جا سکے۔ مغرب میں ایسے اڈے ظاہر ہے مغربی یورپ میں ہو سکتے تھے۔ مشرق بعید میں جاپان، فارموسا اور فلپائن موزوں ممالک تھے لیکن درمیان میں ابھی کوئی علاقہ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ترکی اور ایران موزوں نہیں تھے کیونکہ ان کی سرحدیں روس سے ملتی تھیں۔ افغانستان تو گویا

ان میں رہا تھا ہی محفوظ تھا۔ مصر جو اس وقت شاہ فاروق کی شہنشاہی میں تھا بہت دور تھا۔ دیکھیے برصغیر پاک و ہند رہ جاتے تھے جو ہیئت اور تحفظ کے لحاظ سے موزوں تھے۔

ہندوستان نے مشرق و مغرب کی چپقلش میں اپنے آپ کو ملوث کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پاکستان میں عوام ابھی غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ ایسا کوئی گٹھ جوڑ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

پاکستان میں ایسے گٹھ جوڑ کے لیے فضا پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے اس موضوع پر غور و فکر کرنے کی دعوت نہیں دی گئی تھی نہ اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق تھا۔ لیکن بالائی حلقوں میں جو بات چیت اور بحث و مباحثہ ہوا وہ نیچے کے حلقوں میں بھی پھیل گیا۔ میرے ساتھی بریگیڈیر (جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) حبیب اللہ خان نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا — "پاکستان ایک خوبصورت عورت کی مانند ہے جسے اپنے آپ کو اونچی بولی دینے والے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہئے"— آخر کار امریکہ کے ساتھ ہمارے جو تعلقات استوار ہوئے وہ بریگیڈیر حبیب اللہ کے الفاظ کی عکاسی کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ جواز قابل قبول ہوتا چلا گیا۔ وہ یہ تھا کہ ہمیں کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے طاقت کی ضرورت تھی اور یہ بھی کہ ہمیں ہندوستان سے اپنا دفاع کرنا تھا۔ اس لیے ہمیں امریکہ سے دوستی کرنی پڑی۔ ہم نے بارہ سال قرضے لیے۔ امداد لی۔ اسلحہ بارود مانگ مانگ کر جمع کیا لیکن جنرل ایوب خان اس سے ۱۹۶۵ء میں سترہ دنوں سے زیادہ لڑ نہ سکا اور اسے اپنی دوستوں کے دروازوں پر دستک دینی پڑی جن کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کو زنجیروں کی طرح جکڑا ہوا ہے جن کو ہم تنکوں کی طرح توڑ دیں گے۔ ایک سے اس نے مدد مانگی اور دوسرے سے امن۔

پنڈی سازش کیس

۲۳ فروری ۱۹۵۱ء کے روز میرے گھر میں آخری میٹنگ ہوئی جسے "پنڈی سازش کیس" بنا کر خوب مشہور کیا گیا۔ اس میٹنگ نے سات گھنٹوں کی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مجوزہ کارروائی پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

میری تجویز یہ تھی کہ کشمیر میں کارروائی شروع کرنے سے پہلے پاکستان میں ایسی حکومت لائی جائے جو ہماری کارروائی کی پشت پناہی کرے۔ گورنر جنرل کے لیے مجوزہ اعلان ہم

میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے پنڈی سازش کیس کے کاغذات میں ابھی تک موجود ہے۔
اس اعلان کے چیدہ چیدہ نکات یہ تھے کہ [illegible] حکومت کو برطرف کر دیا جائے، نگران
سول گورنمنٹ بنائی جائے، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کے لیے تاریخ
مقرر کی جائے، آئین بنانے کے لیے آئین ساز اسمبلی بنائی جائے، انتخابات میں غیر
جانبداری قائم رکھنے کے لیے فوج کی غیر جانب دارانہ مشینری استعمال کی جائے اور تمام
جرنیلوں کی ایک مشاورتی فوجی کونسل بنائی جائے۔

یہ خاص طور پر پیشِ نظر رکھیے کہ جنرل ایوب خان نے ۱۹۵۸ء میں جو اقدام کیا تھا
یعنی مارشل لاء نافذ کیا تھا، میری تجویز اس سے بہت ہی مختلف تھی اور ایوب خان کی کارروائی
کے ساتھ اس کی ذرہ بھر مشابہت نہیں تھی۔ اس نے دو بار آئین منسوخ کیا۔ جبکہ
ہم جمہوری آئین نافذ کرنا چاہتے تھے۔ ایوب خان نے ملک میں دو بار مارشل لاء نافذ
کیا۔ جبکہ ہم سول لاء میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ایوب خان نے ملک
پر دو بار ڈکٹیٹر شپ مسلط کی۔ جبکہ ہمارا مدعا اور مقصد یہ تھا کہ ان حالات کو ختم
کیا جائے جن میں آئین کو منسوخ کر کے ڈکٹیٹر شپ مسلط ہو جاتی ہے۔

اس وقت بہت کچھ کہا گیا تھا۔ ابھی تک بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر ہم
اپنی کارروائی کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو بہت سے لوگ قتل ہو جاتے —— یہ سراسر
جھوٹ اور بے بنیاد ہے۔ استغاثہ کے اپنے گواہوں اور وعدہ معاف گواہوں نے عدالت
کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ کسی کو بھی گولی مارنے کا ارادہ نہیں تھا یعنی
قتل اور خون خرابہ ہمارے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ اور نہ ہی کسی کو گرفتار کرنے کا
پروگرام تھا۔ سماعت کرنے والے ٹریبونل کے چیئرمین جسٹس سر عبدالرحمٰن گواہوں
کے یہ بیان سن کر حیران ہوئے تھے کہ میں نے یہ طے کیا تھا کہ ہتھیار خالی رہیں گے یعنی
کوئی گولی نہیں ہوگی اور نہ ہی کسی کو گرفتار کیا جائے گا —— ہر کسی کو معلوم ہو گیا تھا کہ
ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا پھر بھی بعض حضرات یہ دعوے کرتے رہے کہ انہیں
گولی ماری جانی تھی یا انہیں گرفتار ہونا تھا کیونکہ وہ حکومت کے منظورِ نظر تھے۔
سوچ اور فکر کے مطابق ۲۳ فروری ۱۹۵۱ کے فیصلے نے بات ختم کر دی تھی۔

اس کے بعد میرے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے یہ تو سوچا بھی نہیں تھا
کہ ہماری میٹنگ کے متعلق حکومت کو علم ہی نہ ہو سکے گا۔ البتہ مجھے یہ علم نہ ہو سکا کہ میرے
خلاف کاروائی شروع ہو چکی ہے۔ حکومت نے ہمیں گرفتار کرنے کی تاریخ ۷ مارچ ١٩٥١
مقرر کی تھی۔ اس روز پنجاب میں انتخابات شروع ہونے والے تھے۔

جس روز گرفتاریاں عمل میں آئیں اس سے ایک رات پہلے لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ
مجھے یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ چند افواہیں سنی جا رہی ہیں کہ میرے خلاف کاروائی ہونے
والی ہے ـــ لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ نے میری میٹنگ کی رپورٹ پہلے سے ہی ایوب خان
کو دے رکھی تھی اور مقدمے میں وہ سلطانی گواہ بن گیا تھا۔ مجھے افواہوں کی اطلاع دیتے
وقت وہ ظاہری بلکہ مصنوعی طور پر میرے تحفظ کے متعلق فکر مند تھا۔ اس نے مجھے مشورہ
دیا کہ میں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت اختیار کر لوں ـــ میں نے اسے کہا کہ میں نے جو
کچھ کیا ہے اس کی تمام تر ذمہ داری کو بھی قبول کرتا ہوں اور نتائج کو بھی۔

البتہ مجھے بجا طور پر توقع یہ تھی کہ میرے خلاف جو بھی کاروائی ہوگی وہ قانون کے
مطابق ہوگی اور جس کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ افسروں کی طرح مجھے گھر میں نظر بند کیا جائے گا
پھر کمانڈر انچیف کے سامنے پیش کیا جائے گا، چارج شیٹ بنے گی، انکوائری ہوگی اور
اس کے بعد کورٹ مارشل ہوگا۔ میں نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔
چھپانے والی کوئی بات ہی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ کوئی خط کاغذ یا دستاویز ضائع
نہ کی۔ میرے ضمیر پر چونکہ کوئی بوجھ نہ تھا اس لیے میں آخری رات بھی روز مرہ کی طرح
اطمینان کی گہری نیند سویا۔ حالانکہ دو مختلف ذرائع مجھے خبردار کر چکے تھے کہ اپنے بچاؤ
کے لیے کچھ کر لوں۔ البتہ مجھے یہ علم نہیں تھا نہ توقع کہ میرے خلاف جو کاروائی ہوگی اس
کا طریقہ کار قانون کے منافی ہوگا۔

میری گرفتاری کا ڈھونگ اور ڈرامہ

میں جب اطمینان کی گہری نیند سویا ہوا تھا تو سحر کے وقت ایک سو افراد میرے
گھر کو محاصرے میں لے چکے تھے اور میرے چوکیدار پر انہوں نے کامیابی سے قابو پا لیا تھا۔

صبح چھ بجے جنرل ضیاالدین نے میرے سونے والے کمرے کی کھڑکی پر دستک دی۔ میری آنکھ کھلی تو اس نے کہا کہ میں ایک نہایت ضروری کام کے لیے اس سے فوراً جا کر بات کروں۔ میں جوتے پہنے بغیر، سنتری کے دروازے سے ہوتا ہوا فوراً باہر نکلا۔ میں جونہی باہر نکلا بہت سے جوان سنگینیں اور سٹین گنیں لگے تانے ہوئے مجھ پر قابو پانے کو تیزی سے بڑھے۔ وہ سامنے سے بھی آئے اور پہلوؤں کی طرف سے بھی۔

جنگ عظیم دوم کے دوران جاپانیوں نے بھی اسی طرح مجھ پر قابو پایا تھا لیکن تعداد کا تناسب اس طرح نہیں اور ایک نہیں تھا اور نہ ہی مجھ پر جاپانیوں نے ایسی حالت میں قابو پایا تھا کہ میں نہتہ تھا — مجھے سوچنے کے لیے صرف ایک لمحہ ملا۔ میں نے انہیں آنے دیا۔ میں نے کوئی حرکت نہ کی جیسے میں نے انہیں دیکھا ہی نہ ہو یا جیسے مجھے ان کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔ میرے اس انداز بے نیازی نے ان کے ڈھونگ اور سوانگ کو ناکام اور مضحکہ خیز بنا دیا۔ وہ راستے میں ہی مجھ سے دُور رُک گئے۔ میرے جسم تک کوئی سنگین کوئی سٹین گن نہ پہنچی اور جو چند ایک ہاتھ میرے جسم پر رکھ دیے گئے تھے، اپنے آپ ہی میرے جسم سے ہٹ گئے۔

مجھے صرف ٹیلیفون پر بتایا جا سکتا تھا کہ میں حراست میں ہوں۔ لیکن یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ صورت حال بڑی ہی سنگین ہے۔ فوج تک کو تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اور یہ لوگ جو مجھے گرفتار کرنے آئے تھے اس خوف میں مبتلا تھے کہ کوئی بڑا ہی جری اور جابر آدمی انہیں گولیوں سے مار ڈالے گا۔ بہت بعد میں مقدمے کی سماعت کے دوران استغاثہ کا وکیل، اے۔ کے بروہی اسی پر اترا رہا تھا کہ میرا فوجی ریوالور میرے بستر کے پاس پڑا تھا اور یہ گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔

یہ ڈھونگ جنرل ایوب خان کے اس یقین کے زیر اثر رچایا گیا تھا کہ فوج کے دو ڈویژن میری پشت پناہی کے لیے تیار ہیں اور وہ میرے اشارے پر حرکت میں آ جائیں گے۔ یہ تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ دو ڈویژن ہیں کہاں؟ یہ ڈویژن فوج میں تو ہو نہیں سکتے تھے۔ جنرل ایوب خان کو بریگیڈیئر (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) حبیب اللہ خان اور لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ سے ان کا سراغ مل سکتا تھا۔ وہ خود بھی ہر ایک ڈویژن کمانڈر سے رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ پھر یہ دو ڈویژن کس کے تھے؟ — یہ ایوب خان کی اختراع

تھی۔ اگر یہ ڈویژن فوج میں نہیں تھے تو یہ کوئی پرائیویٹ آرمی ہو سکتی تھی مگر بیس ہزار نفری کی پرائیویٹ آرمی میرے گھر میں یا ارد گرد کہیں چھپائی نہیں جا سکتی تھی۔ اگر چھپائی جاتی بھی تو اس کا کوئی سراغ، کوئی شہادت تو مل جاتی۔

یہ ایک ناقابلِ یقین اختراع تھی۔ حیرت اس پر آتی ہے کہ انسان کا تخیل کتنی دور تک پہنچ سکتا ہے لیکن وہ انسان جس کے دماغ میں یہ بے بنیاد خیال آسکتا ہے کہ روس کو ہمالیہ سے پیش قدمی کر کے ہم پر حملہ کر دے گا، دو ڈویژن کی اختراع اس دماغ کے لیے کوئی حیران کن تخیل نہیں۔

میں ان آدمیوں کے ساتھ پولیس کی کار کی طرف چل پڑا۔ کار گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ ایک جھاڑی کے پیچھے سے ایک سپرانٹنڈنٹ پولیس برآمد ہوا۔ گیٹ پر مجھے پولیس کا ڈی۔ آئی۔ جی ملا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ اور کچھ دور پیچھے سے میجر جنرل حیا الدین ایک بار پھر نمودار ہوا۔ اس نے میرے ارد گرد کھڑے آدمیوں کے اوپر سے مجھے ایک کاغذ دیا۔ یہ گورنر جنرل کا حکم نامہ تھا۔ مجھے کہا گیا کہ یہ پڑھ کر اس پر دستخط کر دوں اور واپس دے دوں۔ میں نے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ حکم نامہ ملنے کے وقت سے مجھے انڈین آرمی ایکٹ سیکشن ۱۳ کے تحت فوج سے ڈسمس کیا جاتا ہے۔

میں نے اس حکم نامے پر لکھا کہ یہ حکم غیر قانونی ہے کیونکہ میں انڈین آرمی ایکٹ کے تحت نہیں ہوں۔ اور میں جس آرمی ایکٹ کے تحت ہوں اس کی رو سے گورنر جنرل کو اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی آرمی آفیسر کو سروس سے ڈسمس کر سکے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ مجھے سول پولیس نے جو گرفتار کیا ہے وہ بھی غیر قانونی ہے کیونکہ میں ابھی تک سروس میں ہوں اور افسر ہوں — میں نے یہ تحریر لکھ کر حکم نامہ میجر جنرل حیا الدین کو دے دیا — اور وہاں سے میری وہ طویل مسافت شروع ہوئی جس کی منزل کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔

غیر انسانی قانون اور بربریت

حراست کے ابتدائی تین مہینوں کے دوران مجھے اور دوسروں کو مختلف مقامات پر قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ ہمیں اخباروں، خطوط اور اپنے لواحقین کی ملاقاتوں سے محروم

رکھا گیا۔ ہمیں چارج شیٹ بھی نہ دی گئی نہ ہمیں اپنے وکیلوں سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ ادھورا طور پر منقطع رہا۔ پھر حیدرآباد جیل کے اندر مقدمے کی خفیہ سماعت شروع ہوئی۔ استغاثہ کی طرف سے دو سو پچاس گواہ پیش کیے گئے۔ ہم نے صفائی میں ایک بھی گواہ پیش نہ کیا۔ مقدمے کی سماعت "راولپنڈی کانسپاریسی سپیشل ایکٹ" کے تحت ہو رہی تھی۔ یہ ایکٹ ایک بے اصول وکیل کے سوچے ہوئے ذہن کی تخلیق تھی۔ ٹریبیونل کے ایک جج نے کورٹ میں کہا تھا "میں نے ایسا غیر انسانی قانون پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

اس ایکٹ کی رو سے ہمیں اپیل کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کے تحت مجھے پچھلی تاریخوں سے انڈین آرمی ایکٹ کے تحت قرار دیا گیا تھا یعنی اگرچہ ہوتے ہوئے بھی انڈین آرمی ایکٹ مجھ پر لاگو تھا۔ پچھلی تاریخوں سے کوئی قانون کسی پر لاگو کرنا اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ ہماری حکومت نے اس چارٹر کو تسلیم کر رکھا تھا۔

اس سپیشل ایکٹ کے زور پر قانون شہادت کے بنیادی اصولوں کو بھی موڑ توڑ دیا گیا تھا اور یہ دھاندلی کی گئی تھی کہ پولیس کے بیانات اور وزیروں کو بھی شہادت میں قبول کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا ابتدائی رپورٹ والیف۔ آئی۔ آر۔ اس حال میں شہادت میں قبول کر لی گئی کہ ابتدائی رپورٹ تیار کرنے والے پولیس افسر کو بیان اور جرح کے لیے ٹریبیونل کے سامنے پیش ہی نہ کیا گیا۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اس کی قانون اور مقدمات کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

کئی ایک صفحات کی یہ ابتدائی رپورٹ نہایت شستہ انگریزی میں لکھی گئی تھی جس میں نظم و ضوابط کی رعایت تھی اور انداز ادبی۔ اور اس میں لاطینی امریکی سازشوں کے حوالے بھی تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی بہت پڑھے لکھے قابل کا ادب پارہ ہے۔ جب کہ عدالت میں بتایا یہ گیا کہ ایک پاکستانی سب انسپکٹر نے تیار کی ہے۔ یہ ہمیں دکھائی گئی تو ہم نے اس میں ہجوں کی بے شمار غلطیاں دیکھیں۔ خط بھدا تھا اور کئی الفاظ رگڑ رگڑ کر صحیح لکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ابتدائی رپورٹ کا یہ حال دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ سب

انسپکٹر اس قدر کم پڑھا لکھا ہے کہ نقل بھی صحیح نہیں کر سکا۔ میرے وکیل صفائی پاکستان
کے سابق وزیر اعظم سہروردی تھے انہوں نے عدالت کی توجہ ابتدائی رپورٹ کی طرف
دلائی تو عدالت نے بات گول کر کے دبا لی۔ استغاثہ کے وکیل بار بار کہتے رہے کہ ابتدائی رپورٹ
تیار کرنے والے سب انسپکٹر کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ اس وعدے سے مہینے گزرتے
چلے گئے اور مقدمے کے آخر میں اے کے۔ بروہی نے عدالت کو یہ اطلاع دی کہ متعلقہ
سب انسپکٹر کہیں بھاگ گیا ہے اور اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔

بروہی کو چند روز بعد ٹریبونل کے سامنے اس کے اپنے ایک گواہ استغاثہ،
کرنل سلطان نے جھٹلا دیا اور ثابت کر دیا کہ متعلقہ سب انسپکٹر بھاگ کر کہیں نہیں گیا۔ یہیں
ہے اور پولیس کی نوکری میں حاضر ہے۔ بروہی کو معلوم نہیں تھا کہ متعلقہ سب انسپکٹر
کرنل سلطان کا بھائی ہے۔ اس نے جرح کے دوران بتایا کہ اس کا بھائی راولپنڈی میں پولیس
سروس میں موجود ہے۔ اس انکشاف اور ثبوت کے باوجود اسے ٹریبونل کے سامنے نہ لایا گیا
جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس اولین قسم کی ابتدائی رپورٹ کا خالق نہیں تھا۔

ایک مجسٹریٹ سے عام طریقے سے معافی دلا کر دو افراد کو سلطانی گواہ بنایا گیا تھا۔
ان دونوں نے وعدہ معاف گواہوں کی حیثیت سے گواہی دی لیکن سپیشل ایکٹ میں
ایسی گنجائش بھی رکھی گئی تھی جس کے تحت چالیس مزید افراد کو معافی دے کر ان کی شہادت
قلمبند کی گئی جب کہ انہوں نے سازش میں شریک ہونے کے جرم کا اقبال کیا تھا۔
ٹریبونل اس قدر بے بس تھا کہ اقبال جرم کرنے اور اپنے ہی خلاف شہادت پیش کرنے
کے باوجود ان کے خلاف فرد جرم عائد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ سپیشل ایکٹ نے ججوں کو
ایسے اختیارات سے محروم کر رکھا تھا۔

مقدمے کی سماعت اٹھارہ مہینے جاری رہی۔ سزائیں جو دی گئیں وہ چودہ سال
عمر قید سے چار سال سزائے قید با مشقت تھیں۔ سماعت تین ہزار صفحوں پر ریکارڈ
ہوئی اور ججوں کے فیصلے کے صفحات ایک ہزار سے زائد تھے۔ ہمیں نقلیں یا نوٹ لینے کی اجازت
نہیں تھی۔ نہ ہی ہمیں یہ جاننے کی اجازت دی گئی کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے کہ
ٹریبونل کے ایک جج نے ٹریبونل کے فیصلے کے برعکس فیصلہ لکھا ہے۔

مئی ۱۹۵۴ کے آخر میں گورنر جنرل غلام محمد نے کابینہ کو برطرف کر کے اسمبلی توڑ دی۔ سندھ چیف کورٹ نے گورنر جنرل کے حکم جس کے تحت اسمبلی توڑ دی گئی تھی غیر قانونی قرار دے دیا۔ بہرحال فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل کے حکم کو بحال کیا۔ اس قانونی بحث کے دوران اُن قوانین کے متعلق بھی سوال اُٹھے جو اس سے پہلے پاس کیے گئے تھے۔ اپریل ۱۹۵۵ میں لاہور ہائی کورٹ نے ہماری حبس بے جا کی پٹیشن منظور کرتے ہوئے ہم سب کو رہا کر دیا۔

رہائی کے چند گھنٹے بعد حکومت نے ہمیں پھر گرفتار کر لیا۔ تین ہفتے بعد جسٹس ایم آر کیانی کے بنچ نے ہمیں ضمانت پر رہا کر دیا۔ کیس ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ہم نے عدالت میں یہ چارہ جوئی شروع کر دی کہ موجودہ حکومت جس میں جنرل ایوب خان وزیر دفاع تھا، باضابطہ اور قانونی ہے یا نہیں۔ اس دوران پریذیڈنٹ سکندر مرزا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ ساری کابینہ اس بات پر متفق ہے کہ کیس ختم کر دیا جائے لیکن جنرل ایوب خان زور دے رہا ہے کہ ہمیں جیل واپس بھیج دیا جائے۔ دراصل ایوب خان کو ڈر یہ تھا کہ میں باہر رہا تو اسے گولی مار دوں گا۔ ایک روز والئی سوات کے ہاں ایوب خان سے میری ملاقات ہو گئی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اسے گولی مارنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

اکتوبر ۱۹۵۵ میں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا تو حکومت نے راولپنڈی کانسپیریسی

سپیشل ایکٹ کی توثیق کرنا چاہی مگر اس کی بہت مخالفت ہوئی۔ آخر توثیق اس شرط پر ہو لی گئی کہ اس ایکٹ کے سزا یافتہ کسی بھی فرد کو جیل نہیں بھیجا جائے گا۔ ایک غیر ملکی مصنف کیتھ کیلارڈ نے اپنی انگریزی کتاب "پاکستان" (جو ۱۹۵۷ میں چھپی تھی) صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے "— سازش کے ترکوں کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہر کسی کو یقین تھا کہ ان کا بنیادی مقصد اور منصوبہ یہ تھا کہ کشمیر کو فوجی کارروائی سے فتح کیا جائے — اس نے آگے چل کر لکھا ہے — "اس کارروائی کے منصوبے کے متعلق جو بھی شہادت سامنے آئی تھی وہ منظر عام پر نہیں لائی گئی۔"

رہائی کے چند ماہ بعد ۱۹۵۵ میں، میں نے کشمیر کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے کے عنوان

نے ایک پمفلٹ لکھا اور شائع کیا۔ اس کی پانچ ہزار کاپیاں چھاپی گئی تھیں۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں یہ پمفلٹ بڑی ہی گرم بحث کا موضوع بنا اور ہندوستان کے بعض اخباروں نے اس کے متعلق شہ سرخیاں لگائیں۔

اس پمفلٹ میں میں نے لکھا تھا کہ اقوام متحدہ اور سیکورٹی کونسل کو بار بار اپیلیں کرنے سے اقوام متحدہ سے کچھ بھی نہیں کرایا جا سکتا کیونکہ سیکورٹی کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ حل یہی ایک ہے کہ ہم مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی مدد کریں تاکہ وہ اپنی آزادی کے لیے لڑ سکیں۔ اور اگر ہندوستان پاکستان پر کشمیریوں کو مدد دینے اور مداخلت بے جا کا الزام عائد کرے تو یہ بھی بہتر ہوگا۔ کیونکہ اس سے بین الاقوامی امن کو خطرہ لاحق ہو گا۔ تب اقوام متحدہ کے لیے جواز پیدا ہو گا کہ وہ اس مسئلے کی طرف توجہ دے۔ اور اگر یہ بدترین صورت پیدا ہو گئی کہ ہندوستان پاکستان پر حملہ کر دے تو عالمی برادری اس کے خلاف مداخلت کرنے پر مجبور ہوگی۔ بہر حال، تمام تر انڈین آرمی مغربی پاکستان کے نصف کو بھی تسخیر کرنے کے لیے کافی نہیں تھی۔

مقبوضہ کشمیر میں گوریلا اور کمانڈو بھیجو

پریذیڈنٹ سکندر مرزا کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کشمیر کے اندر کارروائی کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ مقبوضہ کشمیر میں صرف پانچ سو آدمی داخل کر دیے جائیں تو کافی ہوں گے۔ تو سکندر مرزا بہت حیران ہوا۔ کشمیر کا اندرونی علاقہ گوریلا اور سبوتاژ (تباہ کار) کارروائیوں کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اس وقت صرف ایک بڑی سڑک تھی جس کی لمبائی چند سو میل تھی۔ یہ سڑک بر چند فرلانگ بعد مڑتی اور جنگلوں سے اٹی ہوئی پہاڑیوں اور وادیوں میں سے گزرتی تھی۔ اور اس راستے میں بے شمار چھوٹے بڑے پل آتے تھے۔ اس سڑک کی اور ریل کی واحد سپلائی لائن کی اور اس کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے تاروں کی ہر میل اور ہر جگہ حفاظت دشمن کے لیے ممکن نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سڑک کا بیشتر حصہ غیر محفوظ تھا اور دریائی ٹرانسپورٹ کو بھی جس پر کشمیر کی تجارت کا

انحصار تھا، آسانی سے زد میں لایا جا سکتا تھا۔

میں نے اس پر زور دیا تھا کہ کم سے کم جوان استعمال کیے جائیں۔ صرف دو جوانوں کو ایک میل کا علاقہ دیا جائے جہاں وہ اپنی گوریلا کارروائی کریں۔ اس طرح وہ دیکھے نہیں جا سکیں گے۔ ان کے لیے فائر بندی لائن پار کرنا مشکل نہیں تھا۔ یہ لائن کئی جگہوں سے کھلی تھی جہاں سے انسان اور مویشی غیر قانونی طور پر ادھر ادھر آتے جاتے رہتے تھے۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ میری سکیم یہ بھی تھی کہ یہ آدمی مقامی باشندے ہوں یا مقامی لباس میں جائیں۔ ان کے پاس پل اڑانے کے لیے بارود (ڈائنامیٹ) اور تار کاٹنے کے لیے پلاس ہونے چاہئیں۔ اپنی حفاظت کے لیے ان کے پاس چاقو یا دیسی ساخت کا پستول ہونا چاہیے کیونکہ انہیں فوج اور پولیس کے خلاف لڑنا نہیں تھا بلکہ دوروں سے بچنا تھا۔ ان کا ٹارگیٹ وہ پل اور ٹیلیفون وغیرہ کے تار تھے جن پر کوئی پہرہ نہ تھا اور دریائی ٹرانسپورٹ جن کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ تھا۔

ان پانچ سو جوانوں کو اندر بھیجنے کے بعد پانچ سو جوانوں کے ایک اور گروپ کو تیار رکھنا تھا جسے اندر گئے ہوئے گروپ کی جگہ لینی تھی اور اس دوران پانچ سو جوانوں کو ٹریننگ میں رکھنا تھا۔ یعنی بیک وقت پانچ پانچ سو جوانوں کے تین گروپ مصروف عمل رکھنے تھے۔ ایک مقبوضہ کشمیر کے اندر، دوسرا اس کی بدل کے لیے بالکل تیار اور تیسرا زیر تربیت۔ ان کی بنیادی ٹریننگ یہ ہونی چاہیے تھی کہ ان میں صبر و تحمل ہو، طویل عرصے تک سرگرم رہ سکیں، گھبرا نہ جائیں، مشن مکمل کر کے دم لیں اور رازداری کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ انہیں ایک سے ڈیڑھ سال تک مسلسل مقبوضہ کشمیر میں گوریلا کارروائیاں جاری رکھنی تھیں۔ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی تھی۔ اس سارے منصوبے کے اخراجات کا تخمینہ ساٹھ لاکھ تھا۔

پریذیڈنٹ سکندر مرزا نے میری سکیم کو دلچسپی سے سنا اور پوچھا کہ اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ میں نے پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی (پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن) کے چیئرمین کا نام لیا۔ چیئرمین کے ساتھ ٹیلیفون پر بات ہوئی تو اس نے یقین دلایا کہ اس سکیم کے لیے وہ ایک ایک پیسہ دینے کو تیار ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ یہ سکیم عمل کے لیے فوج کے ماتحت ہوگی۔

سکندر مرزا نے مجھ سے پوچھا کہ بھارت نے اگر پاکستان پر حملہ کر دیا تو لاہور کا دفاع بھارتی ٹینکوں کے مقابلے میں کس طرح کیا جائے گا؟ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ لاہور ایک ایسے علاقے کے وسط میں واقع ہے جو تمام کا تمام ہموار ہے۔ ٹینکوں سے اسے محفوظ کرنے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ شہر کے ارد گرد بہت گہری اینٹی ٹینک خندقوں کا ایک سلسلہ تیار کیا جائے — میں نے پریذیڈنٹ کو یہ بھی بتایا کہ حقیقی لاگت سے سو ٹینکوں کی ایک ٹینک رجمنٹ تیار کی جا سکتی ہے۔ اسی لاگت سے ہم ٹینک شکن گنوں کی پانچ رجمنٹیں بنا سکتے ہیں۔ ہر ایک رجمنٹ میں پچاس سے ساٹھ تک گنیں ہوں گی۔ ان گنوں کے علاوہ لاہور کے لیے چند ایک طیارہ شکن گنوں کی بھی ضرورت ہو گی — میں نے پریذیڈنٹ سکندر مرزا کو بتایا کہ لاہور کے علاقے میں باقاعدہ فوج کا صرف ایک بریگیڈ رکھا جائے اور اس کی مدد کے لیے کثیر افراد کی شہری فوج (سول ملیشیا) رکھی جائے۔ یہ فوج شہری تیار کریں اور پاکستان آرمی میں جو ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں ہوں، انہیں لاہور سے دور متحرک حملہ آور قوت کے طور پر دانشمندی سے استعمال کیا جائے۔

سکندر مرزا کے ساتھ میری دوسری ملاقات تین ماہ بعد ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے جرمن ٹینک کور کے مشہور جرنیل گوڈیرین سے بات کی ہے۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ لاہور کے دفاع کا طریقہ خندقیں اور ٹینک شکن توپیں ہی ہے۔ پریذیڈنٹ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ لاہور کے دفاع کے سلسلے میں مطمئن ہو کر اس نے جنرل ایوب خان کو کہہ دیا ہے کہ وہ مقبوضہ کشمیر کی سکیم پر عمل شروع کر دے۔ ایوب خان نے کچھ وقت مانگا تھا کہ وہ اٹلی جا کر ہتھیاروں کی فراہمی کا بندوبست کر لے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیسے ہتھیار فراہم کرنا چاہتا تھا۔ نہ ہی مجھے پتہ چل سکا کہ سکیم پر عمل شروع ہو گیا ہے یا نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ مقبوضہ کشمیر میں ان دنوں چند ایک چھوٹے چھوٹے دھماکوں کی خبریں ملیں۔ ہندوستان نے میرے پمفلٹ کشمیر کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے کا حوالہ دے کر مجھ پر الزام عائد کیا کہ مقبوضہ کشمیر کے اندر کے یہ دھماکے میری ہدایات اور نگرانی میں ہو رہے ہیں۔

صرف ایک بار ایک استقبالیہ پارٹی کے دوران پاکستان کے نئے وزیر اعظم ملک

فیروز خان نون نے میرے کان میں سرگوشی کی ۔" اچھا تو تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہم نے وہ کام شروع کر دیا ہے" ۔ میں بالکل نہ جان سکا نہ اُس نے وضاحت کی کہ اس نے کون سا کام شروع کر دیا ہے ۔ میرے ذہن میں چونکہ کشمیر تھا اس لیے میں یہی سمجھا کہ اس نے مقبوضہ کشمیر کی سکیم کے متعلق مجھے رازداری سے بتایا ہے کہ کام شروع ہو گیا ہے ۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اس کام کے لیے اُس نے سی۔ آئی۔ ڈی کے ڈی۔ آئی۔ جی میاں انور علی کو مقرر کیا ہے ۔ تب سے آج تک میں پریشان ہوں کہ ملک صاحب کا اشارہ کس کام کی طرف تھا ۔ میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ اگر فیروز خان نون کا اشارہ کشمیر کی طرف تھا اور اس نے اس کام کے لیے انور علی کو منتخب کیا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پاکستان کے وزیر اعظموں کو کوئی خصوصی عقل اور وصف حاصل ہے جس سے وہ صحیح کام کے لیے صحیح آدمی منتخب کر لیتے ہیں۔

ہمارے لیڈروں پر خوف طاری ہے

۱۹۵۸ء تک کشمیر کی آزادی کے لیے ایک بھی صحیح قدم نہیں اٹھایا گیا۔ چونکہ کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوا اس لیے ہمیں مجبوراً قومی آمدنی کا بیشتر حصہ دفاعی ضروریات پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ فوجی اخراجات کے علاوہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں آزاد کشمیر گورنمنٹ کے خسارہ بجٹ پر اور قبائلی علاقوں میں لوگوں کو کشمیر میں مدد کے لیے تیار رکھنے پر اور اسی ضمن کے کئی اور الاؤنسوں پر ہم نے بارہ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کیا۔ اگر یہ خرچ ابھی تک بارہ کروڑ روپیہ سالانہ ہی ہے تو ہم ۱۹۷۰ء تک دو سو پچاس کروڑ روپیہ کے لگ بھگ خرچ چکے ہوں گے۔ ان ہوشربا اخراجات کو سامنے رکھ کر سوچیں کہ اگر ہم نصف کروڑ روپیہ مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو اٹھانے اور لڑانے پر صرف کر دیتے تو کئی سال پہلے یہ مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔

دس کروڑ روپیہ کی لاگت سے ہم سارے مغربی پاکستان میں پرائمری سکول بنا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم پانچ کروڑ صرف کر کے اساتذہ اور پچاس ہزار طلباء کی ایک رضاکار فورس بنا سکتے تھے جو چھٹیوں کا کچھ حصہ لوگوں کو تعلیم دینے میں گزارتی۔

اسی کوشش سے اب تک پاکستان کے کونے کونے میں تعلیم کی روشنی پہنچ چکی ہوتی پھر ایک کروڑ روپیہ صرف کر کے ہم ملک میں پستول، رائفلیں، چند توپیں، مشینیں گنیں اور ہینڈ گرینیڈ بنا سکتے تھے اور اس صنعت کو ترقی بھی دے سکتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ چار سو سال پہلے مغلیہ خاندان کا پہلا بادشاہ بابر اگر یہاں توپیں بنا سکتا تھا تو ہم کیوں نہیں بنا سکتے۔

ملک میں فولاد اور مشین ٹول انڈسٹری کے قیام کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر ہمیں دو سو پچاس کروڑ روپے کا اقتباس مشینی صنعت پر خرچ نہیں کرنا تھا تو اس سے قوم کے نوجوانوں کو چھ مہینوں تک فوجی ٹریننگ دی جا سکتی تھی۔ انہیں مفت کھانا، وردی اور تنخواہ بھی دی جا سکتی تھی۔ اس وقت تک تربیت یافتہ نوجوانوں کی تعداد پچاس لاکھ ہو جاتی۔ اگر کوئی آدمی تصور نہ کر سکے کہ پچاس لاکھ آدمیوں کا مطلب کیا ہوتا ہے تو میں اس کی سہولت کے لیے بتاتا ہوں کہ اگر پچاس لاکھ آدمی کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جائیں تو یہ انسانی دیوار ایک ہزار چار سو میل لمبی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ صف پاکستانی ساحل سے لاہور تک اور وہاں سے کشمیر میں سے ہوتی ہوئی گلگت تک پہنچے گی۔

ایک عام ذہن کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان کو پچاس لاکھ تربیت یافتہ جوانوں کی ضرورت تھی جنہیں خواہ دقیانوسی ہتھیار ہی دے دیے جاتے بجائے ضرورت یہ تھی کہ ان کے ہاتھ میں بھکاریوں کا کشکول دے دیا جاتا جو ہم ان غیر ملکیوں کے آگے پھیلائے رکھتے ہیں جو آقا ہیں دوست نہیں۔

کشمیر کی آزادی کے لیے صرف ایک صحیح قدم نہ اٹھانے کی وجہ سے ہمارے لیڈروں پر ایک خوف طاری رہتا ہے۔ اسی خوف کا نتیجہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے روپے پیسے ضروریاتِ زندگی اور ہتھیاروں کے معاملے میں اپنی آزادی بیچ ڈالی ہے۔ ہم نے اس قدر قرضہ لے لیا ہے جو ہم ادا کرنے کے قابل نہیں۔ اس کیفیت نے بے لگام صنعت کاروں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ اس سے ہندوستان اور پاکستان کی تجارت بند ہوئی اور دونوں طرف کے لوگوں کی آمد و رفت بند ہوئی جس سے عوام کو نقصان پہنچا۔ اسی

کیفیت کی بدولت ہمارے ملک میں غیر ملکی ایجنٹ آئے اور ہماری قومی زندگی
کی رگ رگ میں غیر ملکی مداخلت ہونے لگی۔ ہمارا ہر فیصلہ ہماری ہر حکومت کی تبدیلی
ہر سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسئلہ غیر ملکی چپقلش اور غیر ملکی سیاست بازی کا ذریعہ
بن گیا۔

پھر جو بھی لیڈر اقتدار میں آیا، اس نے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے یہی کہا کہ ہم
باہر سے جو قرضے لے رہے ہیں، غیر ممالک سے جو دوستی کر رہے ہیں اور دفاع پر جو
خرچ کر رہے ہیں وہ کشمیر کی خاطر اور ہندوستان کے خطرے کے پیش نظر کر رہے ہیں۔
یعنی یہ کشمیر کی آزادی اور پاکستان کے لیے ہو رہا ہے۔ یہ رٹ لیڈروں نے ہمیشہ لگائے
رکھی اور اس حال میں لگائے رکھی جب غیر ملکی طاقتیں کھلے بندوں کہہ رہی تھیں
کہ وہ پاکستان کو جو اسلحہ دے رہی ہیں اور جو دوستی قائم کر رہی ہیں وہ ہندوستان
کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

ہمارا یہ حشر صرف اس لیے ہوا کہ ہم نے ابتدا میں کشمیر کے متعلق اپنی ذمہ داری
کا سامنا مردانہ وار نہ کیا۔ اور ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہے۔ ایسی قوم آزاد
نہیں رہ سکتی جو ان خطروں کا سامنا نہ کر سکے جو آزادی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہمارے
لیڈروں کے ذہن میں شروع سے ہی خوف گھر کر گیا تھا۔ قائد اعظم نے جو جال قائم کی
تھی ہم وہ بھی بھلا بیٹھے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے روز جب کہ قائد اعظم کو اپنی زندگی کا
مشن پورا کیے تین مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے، اُن میں اتنی جرأت تھی کہ انہوں
نے کشمیر پر حملے کا حکم دے دیا اور یہ حکم پاکستان کے وجود کو خطرے میں ڈال کر دیا۔

ان میں عقل سلیم تھی جس سے انہوں نے ایک اہم اور نازک نقطہ دیکھ لیا تھا۔ ایک آزاد
قوم کی قیادت کا حوصلہ انہی میں تھا۔ وہ دنیا سے اٹھ گئے تو ہم میں شکوک و شبہات
آ گئے۔ لیاقت علی خان وفات پا گئے تو اتحاد ختم ہو گیا۔

اس کے بعد جو بھی آئے، دلوں پر خوف کے سائے گہرا گئے مگر انہیں ایسے چھلکے چہرے
جو اوڑھ لیے گئے جو صرف ذاتی مفاد کی نشاندہی کرتے تھے۔ وہ مفاد پرستی کو چھپا سکتے پھر
انہیں چھپانے کی ضرورت ہی نہ رہی کیونکہ اس لوٹ کھسوٹ میں اور بھی بہت سے تھے۔

سال ہو گئے تھے۔ اس کے بعد حقیقی یا تصوراتی خوف کے زیرِ اثر غلط فیصلے ہونے لگے۔ یہ
ہندوستان کا خوف تھا جس نے ہمیں غیر ملکی آقاؤں کا محتاج اور غلام بنایا۔ ہمارے
لیڈروں پر اپنے عوام کا بھی خوف طاری تھا۔ اسی لیے ملک میں اسلحہ بنانے کی صنعت
قائم نہ ہونے دی گئی۔ نہ ہی نوجوانوں کو جنگی ٹریننگ دی گئی۔ غالباً ہم تعلیم پھیلانے سے
بھی ڈرتے تھے۔ چونکہ ہم جمہوریت سے اور اقتدار کھو جانے سے ڈرتے تھے اس لیے
ہمارا آئین سرے سے بنا ہی نہیں۔ وہ بھی ایک خوف کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۴۸ء-۱۹۴۹ء
کی جنگِ کشمیر کے دوران ہمارا کوئی بھی لیڈر اپنے جوانوں کو دیکھنے یا صورتِ حال
کا قریب سے جائزہ لینے کے لیے محاذ پر نہ گیا۔ دوسری طرف نہرو اور شیخ عبداللہ،
بھارت کے وزیر اور جرنیل اپنے فرنٹ پر باقاعدگی سے آتے رہے۔ ہماری طرف
سے کسی لیڈر نے سرحد تک پار نہ کی۔ وہ رات کے وقت بھی نہیں آئے۔ اندھیرے
میں بھی نہ آئے۔ کوئی ایک بھی وزیر، کوئی ایک بھی سیکرٹری نہ آیا۔ وزیرِاعظم کا
سب سے زیادہ قابلِ اعتماد مشیر بھی محاذ کو ایک نظر دیکھنے نہ آیا۔

کشمیر کے مسئلے کے ساتھ آج بھی وہی خوف چپکا ہوا ہے جو ابتدا میں تھا۔ اُدھر
جونہی ہندوستان نے اپنی سرحد پر چین کا دباؤ محسوس کیا، اس نے غیر جانبداری ترک کی۔
چین کے خلاف روس اور امریکہ کے مشترکہ محاذ کو دیکھ کر پاکستان اور اس کے سیاسی
لیڈروں پر ہندوستان اور کشمیر کے متعلق نمایاں طور پر خاموشی طاری ہوگی۔ ہو سکتا ہے
اس پس منظر میں سی۔ راجگوپال اچاریہ کی وہ تجویز ہو جس میں اس نے کہا تھا کہ کشمیر کو
دس سال کے عرصے کے لیے اقوامِ متحدہ کی غیر جانبدار انتظامیہ کے حوالے کر دیا
جائے۔ بظاہر یہ تجویز بے ضرر نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت
سامنے آتی ہے کہ ہندوستان اس طرح پانچ سو میل لمبی سرحد کو چین کے خطرے سے
بچانے کی ذمہ داری سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کشمیر کے مسئلے کے حل
تک ہم پر اپنے دفاع کی جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان میں کوئی کمی نہیں آتی۔

لہٰذا ہمارے لیے دانشمندانہ لائحہ عمل آج بھی یہی ہونا چاہیے کہ ہندوستان
پر زور دیتے رہیں کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق کشمیر میں غیر جانبدارانہ استصواب
کرائے اور دوسرا یہ کہ ہم مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی مدد کریں تاکہ وہ ہندوستان سے

آزاد ہو گئے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ ایسی مدد دینے کے لیے پاکستان کو جارحیت نہیں کرنی
پڑے گی۔ فائر بندی کی خلاف ورزی کرنی پڑے گی۔ بس اتنا سا کام کرنا ہے کہ پاکستان
کے رنگ یا کوئی اور مقبوضہ کشمیر کو مدد دینا چاہیے تو اسے نہ روکا جائے۔ دوسرے
لفظوں میں اسے یوں سمجھئے کہ فائر بندی لائن پر جاری جو قدم ہو وہ مقبوضہ کشمیر جانے
والی مدد کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے۔

ایسے اقدام کو کوئی جنگ کے لیے جواز نہیں بنا سکتا۔ مگر پاکستان میں ایک طبقہ
ایسا ہے جو مسلح جہاد والا اقدام سے بھی گریز کرتا ہے کیونکہ وہ ابھی تک اس وہم میں
مبتلا ہے کہ اس سے ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے گی اور پاکستان کا خاتمہ ہو
جائے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فوجی طاقت کے لحاظ سے ہم ہندوستان کے مقابلے میں کمزور
ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس دلیل پر سنجیدگی سے نظرثانی کریں۔

ہم کمزور نہیں

فن حرب و ضرب میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ لشکری اور سامان کے لحاظ سے ہم دشمن
کے برابر ہوں تو ہی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ پہلے دیکھا جائے
کہ اپنے پاس کیا کچھ ہے پھر اسی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ بہت دفعہ ایسے
ہوا ہے کہ بالکل تھوڑی سی لشکری کو نہایت اچھی قیادت مل گئی تو اس نے کئی گنا بڑی
لشکری کے آمنے سامنے آ کر قواعد کا توازن قائم کر لیا۔ اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو قومیں حریف
کا پلہ بھاری دیکھ کر جنگوں سے دستبردار ہو چکی ہوتیں۔ جنگ برطانیہ (دوسری عالمی
جنگ) کوئی نہ لڑتا۔ کوئی چرچل یہ نہ کہتا —— "میرے پاس خون، مشقت، آنسو
اور پسینہ پیش کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں" —— کوئی ڈیگال اپنے شکست خوردہ فرانس
کو یہ نہ کہتا — "فرانس کی جنگ آزادی کا شعلہ بجھنا نہیں چاہیے۔ یہ شعلہ نہیں بجھے گا۔"
کوئی سالار اپنے ملک کو دشمنوں کے حملے تلے اور اپنے ساتھیوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر یہ نہ
کہتا — دشمن کے لیے ایک بھی انجن، ریل گاڑی کا ایک ڈبہ بھی سلامت نہ چھوڑو۔

اس کے لیے مٹھی بھر اناج بھی نہ چھوڑو نہ پٹرول کا ایک گیلن ——— نذر کر دیا ہوتا نہ رہتا نام۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ، معرکوں، فتح اور شکست کا انحصار اتنے زیادہ عناصر پر ہے کہ انھیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اکیلے جغرافیائی کیفیت کے اثرات، فوائد اور نقائص لاتعداد ہیں۔ پہاڑی علاقے میں دفاع میں لڑنے والے بہت بڑے حملہ آور اور بہت زیادہ مشکلات کے مقابلے میں آسانی سے لڑ سکتے ہیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے جنوبی وزیرستان میں جس کی وسعت ایک اوسط درجے کی تحصیل جتنی ہے ۱۹۳۷-۳۸ء میں انگریزوں کو پچاس ہزار فوج پھیلانی پڑی تھی جسے توپ خانے اور طیاروں کی مدد حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ اس علاقے کے چھوٹے سے حصے پر بھی قبضہ نہیں کر سکے تھے۔ آج بھارت کی تمام تر فوج قبائلی علاقے کو دبا لینے کے لیے کافی نہیں۔

دریا، ریگستان، زرخیز زمینیں جنگ کی ضروریات پر مختلف اثرات ڈالتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کا پانی اور ڈیلٹا جہاں دریا سمندر میں گرتے ہیں زمینی حملہ آوروں کی قوت کی ایک خاص حد مقرر کرتے ہیں۔ اگر ملک بہت وسیع اور عریض ہو اور وہاں کے لوگوں کو متحد کر کے اس طرح عقلمندی سے استعمال کیا جائے جس طرح روس نے نپولین کے خلاف اور پھر ہٹلر کے خلاف استعمال کیا تھا تو دشمن تھک ہار کر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف ہندوستان بہت بڑا ملک ہے لیکن اس کے مختلف خطوں اور قبیلوں میں اتحاد نہیں تھا اس لیے بہت تھوڑی تھوڑی حملہ آور فوجوں نے ہندوستان کو شکست فاش دی۔

مغربی پاکستان میں بنیادی اتحاد ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگوں میں عقیدے کی وجہ سے ایک وحدت قائم ہے۔ اگر ہمیں کوئی طاقتور حملہ آور مغرب کی طرف دھکیلتا چلا جائے تو اس کی مثال سپرنگ کی ہوگی جو دور تک چلا جائے گا۔ اور ایک حد تک پہنچ کر بڑے ہی زور سے پیچھے کو ہٹے گا اور دبانے والے کو دھکا دے کر دور پیچھے پھینک دے گا۔ ہندوستان میں یہ بات نہیں۔ مختلف عقیدوں کے لوگوں میں اتحاد نہ ہوتے کی وجہ سے کسی بھی سمت پیش قدمی کر کے لوگوں کو جغرافیائی اور نظریاتی اختلافات کی بنیاد

پر جدا جدا کیا جا سکتا ہے۔ شودروں اور برہمنوں میں کوئی اتحاد نہیں۔ سکھ، ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مفادات اور دلچسپیوں کے مطابق عمل کریں گے۔ آج بھی ہندوستان کی اندرونی کیفیت وہی ہے جیسی صدیوں پہلے تھی۔ اور آئندہ بھی ایک طویل مدت تک یہی کیفیت رہے گی۔ ہنگامی یعنی جنگی حالات میں یہ کیفیت ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے۔ یہ خاص طور پر پیش نظر رکھیے کہ ہندوستان ہمیشہ ایک سلطنت رہا ہے۔ جب اس پر خود ہندوستانیوں نے حکومت کی تو بھی یہ سلطنت ہی تھی بادشاہی نہیں تھی۔ ان کوائف کی وجہ سے ہندوستان دوسرے بڑے ممالک مثلاً روس، چین اور امریکہ سے بہت ہی مختلف ہے اور ہمیشہ مختلف رہے گا۔

کسی ملک کے لوگوں کی عادات اور خصائل کا بھی اچھا یا بُرا اثر ہوتا ہے مثلاً ہمارے قبائلی پٹھانوں کو اگر ہندوستان پر حملے کی اجازت دی جائے گی تو یہ ملک اُن کے لیے نہایت دلکش اور بہترین شکارگاہ ثابت ہوگی۔ ہندوستان میں ایسا کوئی عقیدہ بھی ہے۔ قبائلیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان کو کم از کم تین لاکھ تنخواہ دار کا لشکر تیار کرنے پڑیں گے۔ ہندوستان کی یہ روایت ہے کہ اس کے لیے ہمیشہ اس سے دو چند رہا ہے اور آج بھی وہ اپنی سلامتی کے لیے اس کی ہی خواہش کرتا ہے۔

جہاں تک مورال کا تعلق ہے نپولین کا اصول پیش نظر رکھنا چاہیے جو یہ ہے کہ نفری اور جنگی ساز و سامان کے مقابلے میں مورال کی طاقت سہ گنا ہوتی ہے۔ الجزائر کوریا اور ویت نام کے لوگوں نے دکھا دیا ہے کہ پُرعزم لوگ کیسی کیسی دشواریوں اور مصائب کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور جذبے والے گوریلے کتنی دُور تک جا سکتے ہیں۔ مورال کی بنیاد خودداری اور عزتِ نفس مضبوط کرتی ہے ––– اور خودداری اور عزتِ نفس غیر ملکی قرضوں اور امداد سے نشوونما نہیں پا سکتی۔

ہمارے محدود مقاصد کے لیے جنگیں دو زمروں میں آتی ہیں۔ ایک تو وہ جنگ جو دو ملک فتح یا شکست تک کسی کی مداخلت کے بغیر لڑتے ہیں۔ ایسی جنگ میں تمام تر طاقت اور ذرائع اس طرح استعمال کیے جاتے ہیں جیسے انہی کے زور پر جنگ جیتی جائے گی۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جنگ کا فیصلہ یہی دو ملک کریں ––– ایسی فیصلہ

کئی جنگیں اب نقل و حمل اور مواصلات کی تیز رفتاری، بڑی طاقتوں اور اقوامِ متحدہ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے کم ہوتی جا رہی ہیں۔ جنگ کا دوسرا زمرہ یہ ہے جس میں دو ملکوں کے تنازعے انہیں میدانِ جنگ میں لے آتے ہیں۔ ایسی جنگ میں ابتدائی طاقت اور چال یعنی پہل ضرب کا بہت اثر ہوتا ہے۔ تاہم یہ اثرات اس پر منحصر ہیں کہ ابتدائی طاقت کس دانشمندی سے استعمال کی گئی ہے۔

ان ہر دو قسم کے حالات میں بڑی طاقتوں کے سوا، اسلحہ کی دوڑ میں شریک ہونا بے مقصد اور بے معنی لگتا ہے۔ بڑی طاقتیں بھی اپنے تحفظ کے لیے بین الاقوامی طاقت میں توازن قائم کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ بہت سی دوسری قوموں کو دوسرے زمرے کی جنگ کی پلاننگ اپنے ذرائع کے مطابق کرنی پڑتی ہے۔

پاکستان میں جس بنیادی غلطی کا ارتکاب ہوتا چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مقابلے میں ہم جب بھی سوچتے ہیں، نفری اور سامان کی بنیادوں پر سوچتے ہیں۔ ہر جنگ، ہر معرکے اور ہر جھڑپ کے متعلق سکیم بناتے وقت اُس وقت کے احوال و کوائف اور کبھی نہ بدلنے والی جغرافیائی کیفیت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ زمین کے نشیب و فراز اور خد و خال کمانڈر کے ایکشن پر بہت اثر ڈالتے ہیں۔ ان کا اثر اس کی منتخب زمین، وقت اور اس کے پلان پر بھی پڑتا ہے۔ کوئی بھی جنگی کارروائی ایک جنگی چال سے شروع ہوتی ہے۔ کمانڈر اپنے لیے صرف اس وقت سود مند اور برتر پوزیشن حاصل کرتا ہے جب کہ اس کی چال اور داؤ عمدہ ہوں۔ مثلاً نپولین کی ایک جنگی چال ملاحظہ فرمایئے۔ اسے جب بڑی فوج کا سامنا ہوتا تھا تو وہ اپنی فوج کو تین کالموں میں تقسیم کر کے پیش قدمی کرتا تھا۔ یہ کالم ایک دوسرے سے دُور دُور ہوتے تھے۔ اس کے دشمن کی فوج بھی اس کے مطابق تین حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ نپولین اپنی فوج کو یکجا کر کے دشمن کی فوج کے ایک حصے پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ یہ حصہ اس کی اپنی فوج کے مقابلے میں کم ہوتا تھا۔ اس طرح وہ دشمن کے ہر حصے کو باری باری شکست دیتا تھا۔

کمانڈر کی قابلیت کا معراج وہ ہوتا ہے جب وہ اپنی فوج کی آخری صف بندی اور مورچہ بندی ڈیپلائے کرتا ہے۔ یہ ایک اہم عنصر ہے۔ ریزرو دستوں کو اچھی جگہ

کر وہ مشکل کے وقت اپنے لیے حالات سازگار کر سکتا ہے۔ انہیں صحیح وقت استعمال
کر کے وہ فیصلہ کن طریقے سے جنگ کا پانسہ پلٹ سکتا ہے یا انہیں پسپا ہوتے ہوئے دشمن
کے تعاقب میں اس طرح استعمال کر سکتا ہے کہ دشمن بالکل مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ ان اقدار و عناصر میں سے چند ایک ہیں جو ایک اچھا کمانڈر اپنے فائدے
کے لیے بروئے کار لاتا ہے اور قارئین کرام نے دیکھ لیا ہوگا کہ کمانڈر کے دماغ کی برتری
کو ان عناصر کو استعمال کر کے کامیابی حاصل کرتی ہے۔ کمانڈر کا دماغ ہی ہے جو اسے کامیاب
یا ناکام بناتا ہے۔ اکثر لوگ یہ دیکھنا بھول جاتے ہیں کہ کمانڈر کون ہے اور کیسا ہے۔ لہٰذا جنگ
کے متعلق سوچتے ہوئے وہ اس کی اقدار کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ قابل کمانڈر یہ ضرور دیکھتا
ہے کہ اس کے مدمقابل کون ہے اور وہ کیسا ہے۔ دماغ جنگ کا بہترین ہتھیار ہے کسی
قوم کا دماغ یا ذہن اپنے اس نظریے یا مقصد کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے جس کی خاطر
وہ لڑتی ہے لیکن کمانڈر کا ذہن اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اکیلا
ہوتا ہے، افسروں کے گورکھ دھندوں سے آزاد ہوتا ہے اس لیے وہ بہت تیزی سے
فیصلے کرتا ہے۔ اسی سے وہ غیر معمولی نتائج حاصل کر لیتا ہے۔

کمانڈر کا ذہن دور رس اور دور بین ہوتا ہے۔ قابل کمانڈر غیر معمولی ذہن کی بدولت
دشمن کے ارادوں اور اس کی اگلی چال کو پہلے سے سمجھ لیتا ہے اور خطرے مول لیتا ہے۔
دراصل اچھے کمانڈر کے ذہن کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ بعض کمانڈر ذہنی قوتوں
کی بدولت دشمن کو لڑائی سے پہلے ہی مفلوج کر دیتے ہیں۔ نپولین کے متعلق مشہور
ہے کہ اس کے دشمن میدان جنگ میں اس کی موجودگی کو ساٹھ ہزار فوج کے برابر سمجھتے
تھے یعنی اکیلا نپولین ساٹھ ہزار فوج کے برابر تھا۔

یہ انہی عناصر کا کرشمہ ہے کہ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ
میدان جنگ میں ایک کمزور فوج نے کئی گنا بڑی فوج پر غلبہ پایا۔ ایسے ذرائع اور
عناصر کو سمجھنا ضروری ہے جن کے دانشمندانہ استعمال سے ایسی فتوحات
حاصل کی گئیں۔

جنگ —— تاریخ کے آئینے میں
کشمیر —— ہمارے آئینے میں

٦٣٦ عیسوی کے موسم بہار میں خالد بن ولید کی فوج کی نفری چوبیس ہزار تھی۔ ہرکولیس نے اس کے خلاف پچاس ہزار نفری کی ایسی فوج بھیجی جو برتر ہتھیاروں سے لیس تھی اور ٹریننگ بھی بہتر قسم کی دی گئی تھی۔ خالد بن ولید کو مایوسی بالکل نہ ہوئی کہ اس کی فتح کا کوئی امکان نہیں۔ بلکہ اس نے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی مقدس سرزمین کے ایک ایک انچ کا دفاع کرے گا۔ وہ صحیح معنوں میں کمانڈر تھا۔ حقیقت پسند اور جنگی چالوں کا ماہر۔ اس کے ذہن میں یہی ایک چال آئی کہ لڑائی کے لیے ایسی زمین منتخب کی جائے جو نفری کی کمی والی کمزوری ختم کر دے۔ چنانچہ اس نے ایک لمبی پسپائی نہ کیا اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دشمن کو جھانسہ دے دیا اور دشمن کو اپنے پیچھے وادی یرموک کے جنوب مغرب تک لے آیا جہاں اس نے اپنی فوج کو اکٹھا کر کے اس طریقے سے استعمال کیا کہ دشمن کا مواصلاتی نظام اور رسد کا سلسلہ توڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا گیا —— تاریخ نے اس معرکے کو فیصلہ کن کہا ہے۔

تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ طارق بن زیاد جب ۷۱۱ عیسوی میں سپین کے ساحل پر جبل الطارق (جبرالٹر) اترا تھا تو اس کے ساتھ صرف سات ہزار نفری کی فوج تھی۔ میدان جنگ میں اس نفری کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ اور اس کے پیچھے کونسی قوت تھی؟ —— صرف یہ کہ شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ کی رضامندی اسے حاصل تھی۔ لیکن، مغربی مبصروں کے کہنے کے مطابق، دمشق سے خلیفہ نے اسے بددلی سے اس حملے کی اجازت دی تھی اور وہ بھی اس پابندی کے ساتھ کہ صرف محدود فوج لے جائی جائے۔ طارق بن زیاد کی پشت پناہی کے لیے پیچھے ممکنہ طاقت جو پہنچی تھی اور اس نے دوسرے ساحل پر اتر کر کشتیاں جو جلا ڈالی تھیں وہ ایک حقیقت تھی یا محض روایت، تاہم طارق بن

زیاد نے نہ موسیٰ کا انتظار کیا نہ اصل فوج (مین باڈی) کا۔ اس نے اس صورت حال
میں رفتار کے عنصر کو زیادہ اہمیت دی ہوگی کیونکہ اس کی دور بین نگاہ میں یہی عنصر
غالب ہو سکتا تھا۔ اس نے الجیبرالٹر کی چٹان کو اڈہ بنا کر اسے مستحکم کرنے میں کافی وقت
صرف کیا اور وہاں سے اس نے شاہ روڈرک سے جنگ لڑنے کے لیے مغرب کی طرف
ساحل کے ساتھ ساتھ وادی بیکا کی طرف پیش قدمی کی۔

کسی نے بھی وثوق سے نہیں کہا یا کہہ سکتا ہے کہ اس پیش قدمی کے دوران اسے
پانچ ہزار کی کمک مل سکی ہوگی اور اس کی نفری سات سے بارہ ہزار ہو گئی ہو۔ اس کے
مقابلے میں روڈرک کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ
چند ایک چھوٹے موٹے سردار باہمی اختلافات کی وجہ سے روڈرک کا ساتھ میدان جنگ
سے چھوڑ گئے تھے تو بھی اس کی اپنی فوج بہتر ہتھیاروں سے لیس تھی، طارق بن زیاد
کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ تھی، اس کا ڈسپلن بھی بہتر تھا ـــ اس کے باوجود جنگ
کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹ جولائی کے روز روڈرک کی فوج تتر بتر ہو کر شکست فاش سے دوچار
ہوئی اور روڈرک ڈوب کر مر گیا۔

۳۳۱ قبل مسیح میں اربیلا کے مقام پر جہاں سکندر اعظم نے دارا کو فیصلہ کن شکست
دی تھی، وہاں سکندر اعظم کو جو کمک ملنے کی توقع تھی وہ دارا کو ملنے والی کمک کا عشر عشیر بھی
نہیں تھی۔ ایرانیوں کے تمام قبائل میں اتحاد بھی تھا۔ انہیں ٹریننگ بھی اچھی ملی تھی۔ ان
کے ہتھیار برے نہیں تھے اور ان میں حوصلہ بھی تھا۔ اس کے باوجود یونانیوں نے ایسی
غالب فتح حاصل کی تھی کہ نوے ہزار ایرانی مارے گئے تھے ـــ ایسے نتائج کس طرح
حاصل کیے گئے تھے؟ اس کا جواب واضح کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

ایرانیوں کی فوج جو عظیم میدان جنگ میں لڑی اس میں تین لاکھ پیادہ اور چالیس ہزار
سوار تھے۔ اس کے علاوہ ایرانیوں کے پاس ہاتھی بھی تھے اور ایسی رتھیں بھی تھیں جن
کے ساتھ درانتیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ ہتھیار اتنا ہیبت ناک تھا کہ دشمن کو بری طرح
ہلاک کرتا، بازو، ٹانگیں اور سر کاٹ کر پھینک دیتا تھا۔ سارے میدان کو ایرانیوں نے
ان رتھوں کے لیے ہموار کر دیا تھا کہیں رکاوٹ نہیں رہنے دی تھی۔

اس ہیبت ناک لشکر کے مقابلے میں سکندر کے ساتھ کل چالیس ہزار پیادہ اور سات

ہزار سوار تھے۔ اس ذرا سی فوج کے مقابلے میں ایرانیوں کا لشکر نا قابلِ تسخیر دیوار تھا لیکن سکندر نے اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ میدانِ جنگ میں جو کچھ ہوا وہ مختصر بیان کرتے ہوئے میں ان مورخین سے معذرت خواہ ہوں جنہوں نے بہت ہی سادگی سے یہ جنگ بیان کی ہے۔

سکندر نے اپنی فوج کو چار روز آرام دیا۔ اس کے بعد ایرانیوں سے تین میل دور یکم فوج کو لے گیا۔ وہاں اس نے ایرانیوں کی صف بندی اور دیگر کوائف کا جائزہ لیا اور پھر تمام میدانِ جنگ کو گھوڑے پر سوار ہو کر دیکھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی فوج دارا کی فوج کے مرکز کے بالمقابل لا کھڑی کی جہاں دارا تھا۔ سکندر کی ترتیب ایک کھوکھلے مربع کی شکل میں تھی۔ بیرونی رخ دستے زاویوں پر تھے جہاں سے وہ ہر سمت لڑ سکتے تھے۔ اس نے رات کے حملے کی بجائے دن کی روشنی میں حملہ زیادہ بہتر سمجھا تھا کیونکہ رات کے وقت دشمن کی چالوں اور حرکات کا قبل از وقت پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ جب اس نے پیشقدمی شروع کی تو ایرانیوں کے بالکل سامنے جانے کی بجائے ان کے بائیں طرف ذرا زاویے سے گیا۔

دارا نے یونانیوں کا یہ رخ دیکھ کر ان کے متوازی اپنے دستوں کی پیشقدمی کرائی اور اپنے گھوڑ سواروں کو حملے کے لیے بھیج دیا۔ حملہ ہوا۔ کچھ مرکے لڑے گئے۔ سکندر نے جوابی حملے کرائے لیکن اس نے اسی سمت اسی زاویے پر پیشقدمی جاری رکھی۔ اس سے وہ اس میدان کے کنارے سے باہر ہوتا چلا گیا جسے ایرانیوں نے رتھوں کے لیے ہموار کیا تھا۔ دارا نے جب دیکھا کہ سکندر ایسی جگہ پہنچ جائے گا جہاں اس کے رتھ بھاگ دوڑ نہیں سکیں گے تو اس نے رتھوں کو حملے کا حکم دے دیا کہ سکندر کی فوج کو بکھیر دیا جائے۔ سکندر رتھوں سے نمٹنے کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے تیروں اور برچھیوں کا مینہ برسانے کا انتظام کر رکھا تھا۔

دارا کے رتھ بہت بڑی تعداد میں سکندر کے دائیں سے گھوم کر اسے روکنے کے لیے آگے جانے لگے۔ سکندر اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اس نے خاص طور پر اس لمحے کے لیے سکیم تیار کر رکھی تھی۔ وہ اپنا گھوڑا اپنے رسالے (گھوڑ سواروں) کے سامنے لے گیا۔ اور

وہاں سے گھوم کر ایرانی فوج کے فرنٹ کی طرف اس شگاف کی طرف بڑھا جو اس نے اپنے
رسالے کی چال سے پیدا کیا تھا۔ اس طرح وہ ایرانیوں کے اس نازک مقام پر آگیا
جہاں دارا موجود تھا۔ اس کا مختصر بیان کیا جا چکا ہے۔ سکندر نے اپنے دشمن کا ردِ عمل
بھانپ لیا تھا۔ اور سکندر کی یہی پیش بینی تھی جو، مورخوں کے کہنے کے مطابق، اس
کی فتح کا باعث بنی۔

۲۱۶ قبل مسیح میں کینا ے کی کلاسیکل جنگ لڑی گئی تھی جس میں کارتھیج کے ہینی بال
کا سامنا ان حالات میں رومیوں سے تھا کہ میدانِ جنگ رومیوں کا تھا۔ اس کے علاوہ
رومیوں کو طاقت میں برتری حاصل تھی۔ رومیوں کی نفری بیاسی ہزار پیادہ اور نو ہزار
سات سو سوار تھی۔ ہینی بال کی نفری چھتیس ہزار پیادہ اور دس ہزار سوار تھی۔ اس کی
نفری تو کم تھی لیکن چالوں کی برتری سے اس نے فتح حاصل کی۔ اس نے نئے چاند کی
ترتیب میں رومیوں کے وسط میں حملہ کیا۔ رومی لشکر چاند کے نرغے میں آگیا۔ حتیٰ کہ
چاند کے دونوں سروں نے عقب میں جا کر رومیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ پولیبیس نے
لکھا ہے "۔۔۔ رومیوں کی فوج کو جیسے زلزلے نے نگل لیا ہو" ـــــ پچاس ہزار رومی
مارے گئے اور پانچ ہزار جنگی قیدی بنے۔ اس کے برعکس ہینی بال کے چھ ہزار آدمی
ہلاک اور زخمی ہوئے ـــــ ہینی بال کے متعلق تسلیم کیا جاتا ہے کہ فنِ حرب و ضرب میں
وہ سکندر اور نپولین سے زیادہ ذہین اور ہوشیار تھا۔

اب ذرا موجودہ صدی میں آئیے۔ پہلی جنگِ عظیم کے آخر میں، ۱۹۱۹ میں ترکی شکست
خوردہ ملک تھا۔ قسطنطنیہ پر اتحادی فوجوں کا قبضہ تھا۔ سلطان محض کٹھ پتلی تھا۔ اور
ان حالات میں مصطفیٰ کمال نے بغاوت کر دی۔ اس کے ساتھ باقاعدہ فوج کی انتہائی
تھوڑی سی نفری اور قبائلیوں کے چند ایک گروہ تھے۔ اس کے پاس نہ کوئی ٹرانسپورٹ
تھی نہ توپخانہ۔ اس نے صرف دو سال کی محنت و مشقت کی مصائب جھیلے۔ یونانیوں
کے ہاتھوں ناکامیوں سے دوچار ہوا۔ کئی بھی پسپائیوں کا سامنا کیا لیکن دو سال کے ہی
قلیل عرصے میں اس نے اسی ہزار فوج سے یونان کی فوج کو دو حصوں میں کاٹ کر اسے
تتر بتر کر دیا۔ یونان کی فوج کا تعاقب کر کے اسے مکمل طور پر تباہ کرنے کا یہ آخری
موقع تھا جس سے مصطفیٰ کمال فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن اب اس کے اور یونانیوں کے درمیان

برطانیہ کی فوجیں آن کھڑی ہوتیں۔
اُن کے لیے یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی کہ برطانیہ کی فوجوں کے خلاف لڑنا اس
کے لیے ممکن نہیں تھا اور نہ ہی وہ یونانیوں کو فیصلہ کن شکست دینے کے اس آخری
موقع کو چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے آخر کار جو کاروائی کی وہ بے مثال ہے۔ ایسی کارروائی،
میرے علم میں نہ کبھی پہلے ہوئی ہے نہ اس کے بعد۔ کمال نے ایک سوچا سمجھا خطرہ مول
لیا تھا۔ اس نے سوچا کہ برطانیہ بڑی لمبی جنگ عظیم لڑ چکا ہے اور تھکا ہوا ہے۔ اُس
نے برطانوی فوج کی طرف پیش قدمی کی لیکن رائفلوں کی نالیاں پیچھے کر رکھی تھیں۔ انگریز
پریشان ہو گئے اور فیصلہ نہ کر سکے کہ جو فوج نالیاں پیچھے کر کے بڑھتی آ رہی ہے۔ اس پر
فائر کھولیں یا نہ کھولیں۔ دیکھو کر رائفل کی نالی پیچھے کیے ہوئے آدمی کو نہتہ سمجھا جاتا ہے۔
اقوام عالم یہ توقع نہیں کر رہا ہو گا۔ اگر دونوں طرفوں میں سے کسی ایک بھی طرف سے
صرف ایک گولی فائر ہوتی تو ترکی کی قسمت سر بمہر ہو جاتی۔ لیکن کسی نے گولی نہ چلائی۔ ترک
انگریزوں کے لگائے ہوئے خاردار تار تک پہنچ گئے اور تار سے گزرتے گئے — اوپر
سے بھی، نیچے سے بھی۔ برطانوی فوج دست بدست جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئی۔
لیکن کمال نے جو کچھ سوچا تھا ٹھیک سوچا تھا۔ انگریز سپاہیوں کو حکم ملا کہ حملہ نہ کریں۔ پھر
جنگ بندی اور صلح ہوئی اور سمرنا ترکی نے جیت لیا۔

ان تمام مثالوں سے ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ جنگ صرف نفری اور ساز و سامان سے نہیں
جیتی جاتی اور یہ بھی کہ جنگی تیاری اسلحہ کی دوڑ اور فوج کی نفری بڑھائے چلے جانے کو نہیں
کہتے۔ بہت بڑی فوج کے بظاہر جو فوائد نظر آتے ہیں وہ بہت بڑے نقصانات
کا بھی باعث بنتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف النوع لڑائیوں میں کمانڈ زیادہ
ہونے کی وجہ سے ان کا سینا ریو اور ردِ عمل بھی کئی اقسام کا ہو جاتا ہے جس سے مجموعی طور
پر نقصان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سپلائی اور ٹرانسپورٹ کی کمی کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔
چھوٹی فوج نقل و حرکت میں تیزی برقرار رکھ سکتی ہے۔ یہ تیزی ہی ایک ایسا
عنصر ہے جو فوجی مفکروں کی نگاہ میں سب پر غالب آ جاتا ہے۔ ایک کمانڈر کو یہ دیکھنا
چاہیے کہ نقل و حرکت میں تیزی ہو، جنگی چالوں میں سہولت ہو اور سپلائی کا انتظام
رواں اور بے عیب ہو۔

چنگیز خان کے متعلق مورخوں نے لکھا ہے کہ اس کی کامیابیوں اور فتوحات کا باعث یہ تھا کہ اس کی فوج بہت بڑی تھی لیکن تفصیلات میں جائیے تو معلوم ہو گا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ منگولوں کی سلطنت اتنی وسیع تھی جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ روم اور سکندر کی سلطنتیں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں۔ منگولوں نے اتنی بڑی سلطنت فوج کی کثیر نفری سے نہیں بلکہ جنگی اہلیت سے حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ اُن کا رسالہ عمدہ تھا، ان کی نقل و حرکت کی رفتار حیران کن حد تک تیز تھی۔ چنگیز خان فنِ حرب و ضرب کا ماہر تھا۔ اس کے بعد صرف نپولین تھا جسے اس کے برابر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

اتنی زیادہ تاریخی مثالیں پیش کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کشمیر کے سلسلے میں ہندوستان کے رویے میں جو ہٹ دھرمی اور غیر صلح جوئی پائی جاتی ہے وہ ہماری اسی غلط سوچ کا نتیجہ ہے کہ نفری اور ساز و سامان ہی غالب عنصر ہے۔ اس خوف کا کوئی جواز نہیں کہ ہم اگر مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو ہندوستان سے آزادی حاصل کرنے میں مدد دیں گے تو ہندوستان سے ہماری جنگ چھڑ جائے گی۔ بہرحال، اگر نوبت جنگ تک آ ہی گئی تو غالباً یہ محدود جنگ ہو گی۔ تاہم جنگ محدود ہو یا طویل اور اگر ہمیں مقصد حاصل کرنے تک لڑنا پڑا تو ہندوستان کی اور ہماری جنگی طاقت کا تقابل ہمارے خلاف نہیں ہمارے حق میں ہی ہے۔

ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان پاکستان کو روند ڈالے گا۔ پاکستان پر قبضہ کرنا تو بہت دُور کی بات ہے۔ ہندوستان کے اندر اتحاد کا علاقائی فقدان ہے جو بیرونی دباؤ سے اور زیادہ بڑھ کر اس کے لیے خطرہ بن جائے گا۔ پاکستان کے لوگوں کو جنگ اور زیادہ متحد کر دے گی، ہندوستان کو نہیں۔

میرا مقصد جنگ کا پرچار ہرگز نہیں۔ لیکن امن کا قیام تب ہی ممکن ہے کہ ہم اپنی اپنی پوزیشن کا ایک دوسرے سے جو تعلق ہے اسے اچھی طرح سمجھیں۔ میرا یہ خیال ہرگز نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ ناگزیر ہے یا جنگ پسندیدہ اقدام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں ملکوں کا زیادہ تر فائدہ امن میں ہی ہے۔ دونوں

ایک دوسرے کی سیاسی اور علاقائی سالمیت کا احترام کر سکتے ہیں جو اسی صورت میں ممکن ہے کہ کشمیر میں غیر جانبدارانہ استصواب ہو جائے اور باقی تمام تنازعات پر بھی سمجھوتہ ہو جائے۔ ہم چونکہ اصولی طور پر خودارادیت کے حامی اور علمبردار ہیں اس لیے بیشتر قومیں ہمارے ساتھ ہیں۔ کشمیریوں کے حق خودارادیت کا مطلب یہ ہے کہ کشمیر میں غیر جانبدارانہ استصواب کرایا جائے۔ استصواب کی اہمیت صرف یہ نہیں کہ ہندوستان نے اس کا وعدہ کیا تھا بلکہ یہ ایک حق ہے جو کشمیریوں نے طویل جدوجہد سے حاصل کیا ہے اور ان کے حق کو اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔

ہمارے لیے استصواب کی حیثیت یہ ہے کہ یہ ہمارا فرض رہا ہے اور اب بھی ہے کہ استصواب کرائیں۔ یہ ایسا فرض ہے جس پر ہماری اپنی بقا کا انحصار ہے۔ اگر ہم نے اس بنیادی اصول پر، اس بنیادی ایشو پر کوئی سمجھوتہ کر لیا تو اس سے ہماری اپنی آزادی کو ضعف پہنچے گا اور آگے چل کر ہم اپنی سالمیت کے خطروں سے بھی سمجھوتہ کریں گے۔

ہمارا مقصد اور مطمح نظر یہ ہے کہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے کی تمام ریاست جموں اور کشمیر میں استصواب کرایا جائے اور پاکستان اور ہندوستان کا ہر تنازعہ اور مسئلہ اسی کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے۔ اگر ہم نے کسی اور مسئلے پر ہندوستان سے بات چیت کی اور کشمیر کو اس سے الگ کر دیا تو اس طرح ہم بتدریج کشمیر کو اسی حال میں ترک کر دیں گے جس حال میں وہ اس وقت ہے اور وہ اسی حال میں چلا آ رہا ہے۔

آخری باب

قبائلی پٹھان ——

کون ہیں! کیا ہیں!

اس روئیداد کے آخر میں قبائلی پٹھانوں کے متعلق چند ایک حقائق اور کچھ تاثرات کا بیان ضروری ہے۔ اس بحث سے میرا کوئی تعلق نہیں کہ قبائلیوں کو کشمیر میں جانا چاہیے تھا یا نہیں۔ وہ چونکہ وہاں گئے اور لڑے اس لیے اُن کے جوہر ہمارے سامنے آئے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کچھ ناخوشگوار اور قابلِ افسوس واقعات بھی ہوئے لیکن ہم اب تک یہ بھی جان گئے ہیں کہ ایسے واقعات کی روک تھام ہو سکتی تھی۔ تاہم یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ قبائلیوں نے کشمیر محاذ پر جا کر ایسا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا جو اور کوئی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اور یہ بھی کہ قبائلی پٹھان پاکستان کی قوت کا ایک اہم حصہ تھے اور اب بھی اہم حصہ ہی ہیں۔ ان کی اہمیت کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبے اور اس کے لوگوں کی طویل اور پُرہنگامہ تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے۔

دریائے سندھ اور ڈیورنڈ لائن کے درمیان ایک محدود سا علاقہ ہے جو باقاعدہ ملک نہیں ہے نہ اس کے کوئی ذرائع آمدنی ہیں لیکن یہ علاقہ اور اس کے باشندے وسطی ایشیا اور برصغیر پاک و ہند کے درمیان سے گزرنے والے تاریخی راستوں پر رکاوٹ بنے رہے ہیں۔ اسے فرنٹیئر کہتے ہیں۔ اس نے جو حملے اور یلغاریں دیکھیں وہ دنیا کے کسی اور خطے نے نہیں دیکھیں۔ فرنٹیئر کے راستوں پر بہت سے قدیم نقوش ثبت ہیں۔ ان میں ایک ہزار

سال پرانا اسلام کا نقش ہے پھر بھی بہت سی دوسری تہذیبوں کے اثرات ہیں۔ قدیم
قبائل کی روایات ان کے خون میں شامل ہیں۔ ان پہ بجائے آپ گیاوہ پٹھانوں اور سنگلاخ
وادیوں کے اثرات ہیں اور اسلام کے بعد ان پر دوسرا بڑا نقش ہتھیاروں کی جھنکار کا
ہے جو صدیوں پرانی ہے اور جو کبھی خاموش نہیں ہوئی۔

چار ہزار سال پرانے ماضی کی دھندلاہٹ میں جھانکیے تو کچھ اس قسم کے سائے نظر آتے
ہیں جیسے آمو دریا اوکسس کے بالائی حصوں سے آریہ لوگ ہندوستان کو جاتے ہوئے
یہاں سے گزرے تھے جہاں جا کر انہوں نے دراویڈوں کو بے ٹھکانہ کر کے جنوب
کی طرف دھکیل دیا تھا۔ چند صدیاں بعد کی دارا (فارس) کی تحریروں میں گندھارا
(وادیٔ پشاور) کو فارس کی سلطنت کا حصہ نظر آتا ہے ـــــ اور ہیروڈوٹس بتاتا ہے کہ
۵۰۰ قبل مسیح میں ایکسرشش کی فوج کا ایک حصہ یہاں کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ
کھالیں پہنتے تھے اور ان کے ہتھیار تیر و کمان اور خنجر تھے ـــــ آج بھی قبائلیوں کا محبوب
ہتھیار خنجر ہے۔

۳۲۷ قبل مسیح میں سکندر نے دارا کی سلطنت پر غلبہ پایا مگر دریائے سندھ عبور
کرنے سے پہلے اسے قبائلیوں سے گذرنے میں پاپڑ بیلنے پڑے۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس
بتاتا ہے کہ اس خطے کے لوگ بے پناہ جنگجو ہیں اور کچھ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے یہ
لوگ آگے سیلاب کی لڑائی میں فارس کی فوج میں تھے۔ اس یونانی مورخ کے دفتروں میں پٹھانوں
کے آفریدی قبائل اسی علاقے میں آباد تھے جہاں وہ آج ہیں۔ اس کے بعد دو صدیاں
کے دوران یہاں ہندوستان سے مایا اور بدھ آئے۔ اس سے اگلی صدی میں گریکو
بیکٹرین آئے جو ستھاؤں کی آمد سے یہاں سے صاف ہو گئے۔ ستھائی ۱۰۰ قبل مسیح میں وسطی
ایشیا سے آئے تھے۔ ان کے ساتھ موجودہ پشتو زبان آئی۔ پشتو کو ستھائی، قدیم ایرانی
اور آریہ ہندی گروپ کا مرکب سمجھا جاتا ہے۔

ستھاؤں کے بعد اوکسس کے پرے سے کشن اور مزدہ آتش پرست آئے جنہوں
نے بعد میں کنشک کے تحت بدھ مت قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے پشاور کو اپنی راجدھانی
بنایا اور روم کی سلطنت تک تجارتی راستے کھولے۔ گندھارا آرٹ اسی دور میں پھیلا

چھوڑا۔ اس کے بعد کئی یلغاریں آئیں۔ کشنوں کے بعد ساسانی آئے۔ پانچویں صدی عیسوی میں ہن آ گئے اور وہ اپنے ساتھ خان کا خطاب لائے جو آج تک پٹھانوں کے ناموں کے ساتھ موجود ہے۔ ۱۰۰۰ عیسوی میں محمود غزنوی آیا جو اپنے ساتھ اسلام لایا اور عظیم مذہب مقبول عام ہوا۔ محمود کے ساتھ ہی پٹھان مسلمانوں کی فوج کے ساتھ ہندوستان میں آنے لگے۔

۱۲۲۱ میں چنگیز خان اور ۱۳۰۰ میں تیمور لنگ وزیرستان کے دائیں اور بائیں سے طوفان کی طرح گزر گئے۔ ۱۴۵۰ء جو خاندان لودھی کا دور تھا، میں پٹھان بڑی تعداد میں ہندوستان میں آباد ہونے لگے۔ یہاں تین صدیوں تک انہوں نے سپاہیوں کی حیثیت سے بڑا اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ سپاہ گری کے علاوہ وہ ناظم بھی رہے بادشاہ بھی۔ مگر ان کے اپنے علاقے، فرنٹیئر میں حالات پر ہنگامہ اور پرآشوب ہی رہے۔

فرنٹیئر بعد میں رہا تو ہندوستانی سلطنت میں ہی اور پشاور دہلی کے گورنر کا دارالحکومت تھا لیکن ہندوستانی حکمرانوں کا کنٹرول اٹک سے خیبر تک جانے والی سڑک سے ادھر اُدھر محض بے اثر تھا۔ اس کے نتیجے میں قبائلی علاقے پر حکمران حملوں پہ حملے کرتے رہے۔ ان کے گھر بار اور مویشی وغیرہ تباہ کر کے انہیں سزا دیتے رہے اور پٹھان ان پر جوابی حملے کرتے رہے۔

۱۵۰۵ء میں ہندوستان کی طرف جاتے ہوئے بابر یہاں آیا۔ آگے بڑھنے کے لیے اسے یہاں ایک مستحکم اڈہ بنانا تھا جس کے لیے اسے پٹھانوں سے کئی معرکے لڑنے پڑے اور اسے کئی سال تک اڈہ بنانے کے لیے یہیں رکنا پڑا۔ پچاس سال بعد، ۱۵۸۶ء کے دوران بابر کا پوتا مغل بادشاہ اکبر دوبارہ دہلی سے یہاں اس مقصد کے لیے آیا کہ جنگل کا سلوک سے پٹھانوں کو مغلوب کیا جائے۔ مگر اس کی دونوں کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اس نے ایک معرکہ یوسف زئی قبیلے کے خلاف سوات اور بونیر میں لڑا۔ اس میں آٹھ ہزار آدمی مارے گئے۔ راجہ بیربل بھی مارا گیا۔ دوسرا معرکہ خیبر کے علاقے میں لڑا گیا۔ اس میں مغلوں کو آفریدی، مہمند اور خلیل قبائل نے پسپا کیا۔

۱۶۲۰ء میں شہنشاہ جہانگیر کے کابل کے گورنر مہابت خان نے تین سو اورکزئی پٹھانوں کو ایک دعوت پر مدعو کیا اور دھوکے سے سب کو قتل کرا دیا۔ مغلوں کے ایک

کمانڈر غیرت خان نے تیراہ پر چڑھائی کی۔ مگر وہ مارا گیا۔ اورک زئی اور آفریدی قبائل نے غیرت خان کی فوج کو شکست دی۔ سات سال بعد ۱۶۳۵ء میں شہنشاہ شاہجہاں کے گورنر مظفر خان نے احداد کو قتل کرا دیا۔ اس کے جواب میں آفریدی اور اورک زئی پٹھانوں نے احداد کی بیوہ کی قیادت میں مظفر خان پر حملہ کیا۔ مظفر خان اپنی تمام عورتوں کو جو اس کے ساتھ تھیں قبائلیوں کے ہاتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔

پچیس سال بعد ۱۶۷۲ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کے پشاور کے گورنر محمد امین نے خیبر کے علاقے میں ایک انتقامی یا تعزیری حملہ کیا۔ وہ قبائلی پٹھانوں کو اس کارروائی کی سزا دینے آیا تھا جو انہوں نے مغل سپاہیوں کے خلاف کی تھی۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ مغل سپاہیوں نے صافی قبیلے کی ایک عورت کو چھیڑا تھا جس سے مشتعل ہو کر پٹھانوں نے مغل سپاہیوں پر حملہ کیا تھا۔ اسے مغل گورنر محمد امین نے پٹھانوں کا باغیانہ اقدام گردانا۔ انہیں سزا دینے کے لیے فوج کشی کی لیکن صافی، مہمند اور آفریدی قبائل نے اس کی فوج کا صفایا کر دیا۔ ساری فوج میں سے صرف محمد امین اور چار اور آدمی بچے۔ مغلوں کا سب کچھ جو وہ ساتھ لائے تھے، پٹھانوں کے ہاتھ لگا۔ اس میں فوج کے علاوہ خزانہ تھا، ہاتھی تھے اور جرنیلوں وغیرہ کی عورتیں بھی تھیں۔ ان میں محمد امین کی اپنی بیوی، ماں، بہن اور بیٹیاں بھی تھیں۔

دو سال بعد مغلوں کو پٹھانوں کے ہاتھوں مزید تباہی کا سامنا ہوا۔ خوشحال خان خٹک اور ایمل خان آفریدی نے نوشہرہ قلعے پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ مغلوں کو خراج درّے میں بھی بہت نقصان ہوا جہاں پٹھانوں سے ان کی لڑائی ہوئی تھی — پچاس سال بعد ۱۷۲۳ء میں آٹھ سال کا وہ دور آیا جب درانی، پشاور، کابل اور قندھار تک ایک دوسرے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، درخیبر میں اضطراب اور افراتفری کی کیفیت طاری رہی۔ اس سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فائدہ اٹھایا۔ اس نے دریائے سندھ پار کیا اور نوشہرہ کی جنگ جیت لی۔ اس کے پاس فرانسیسی تربیت یافتہ فوج تھی۔ اس کے مقابلے کے لیے بڑی عجلت میں یوسف زئی قبیلے کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ انہیں حاکم پشاور اعظم خان درانی کی کمک۔ وہ حاصل نہیں تھی۔ سکھوں نے پشاور وادی کو تہ تیغ

توڑ لیا اور شہر کو بھی بہت تباہ کیا لیکن وہ وہاں قدم جما نہ سکے۔ ۱۸۳۷ء میں پشاور کا گورنر ہری سنگھ لڑائی میں مارا گیا ـــــ اور ۱۸۴۹ء میں انگریز پشاور تک پہنچ گئے۔ انگریزوں نے ۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء تک حکمرانی کی۔ فرنٹیئر میں انہوں نے سڑکیں، شہروں اور کئی ادارے بنائے اور ایڈمنسٹریشن بھی بہتر طور پر قائم کی لیکن یہ دور امن کا دور نہیں تھا۔

۱۸۵۰ء سے ۱۹۰۱ء کے چوبیس سالہ دور میں انگریزوں نے قبائلیوں کے خلاف تیئس جنگی مہمیں بھیجیں۔ ۱۸۶۳ء میں بونیر کی سرحد پر امبیلا کے مقام پر جہاں شہنشاہ اکبر کی فوج نے شکست کھائی تھی، پٹھانوں نے انگریزوں کی چھ ہزار فوج کو ایک جگہ محصور کر لیا۔ اسے ہلنے نہ دیا۔ یہ فوج چھ ہفتے محض اپنی جانیں بچانے کے لیے لڑتی رہی آخر سمجھوتہ کر لیا گیا جس سے انگریزوں نے اپنا پہلا مقصد حل کر لیا لیکن سوات اور بونیر میں داخل ہونے کے لیے انگریزوں کو تیس سال لگے۔

۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیانی عرصے میں کرم اور ملاکنڈ میں انگریزوں نے تین بار فوج کشی کی۔ پھر ۹۸-۱۸۹۷ء میں انہوں نے تیراہ، باجوڑ، سوات، بونیر اور مہمند علاقے میں اتنا بڑا جنگی آپریشن کیا جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔

جہاں تک وزیرستان کا تعلق ہے، تاریخ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی نے اس پر حکمرانی کی ہو۔ غالباً انگریز واحد قوم ہے جو اس علاقے میں داخل ہوئی اور اندر چھوٹے بڑے قلعے بنائے لیکن ان کی حکمرانی قلعوں کے اندر محصور رہی۔ باہر وہ کوئی حکم نہ چلا سکے نہ کوئی ٹیکس عائد کر سکے۔ وزیرستان میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء کے دوران بہت بڑی جنگی کارروائیاں کی گئیں۔ ان میں بھی پٹھانوں نے تاریخ کو دہرایا اور ثابت کر دیا کہ جو بھی آئے گا اسے شکست دی جائے گی۔ اہنائی تنگی میں محسود قبائل پانچ دن تک جدید ہتھیاروں (رائفلوں) سے لڑے اور تلواروں سے دست بدست بھی لڑے انہوں نے جدید رائفلیں پوری مہارت سے استعمال کیں۔ انگریزوں کے دو ہزار افراد ہلاک، زخمی اور لاپتہ ہوئے۔ ان میں ۴۳ افسر ہلاک شامل ہیں۔ قبائلیوں کا نقصان اس سے دگنا ہوا لیکن انہوں نے ایک بار پھر اپنی آزادی کو بچا لیا تھا۔

۱۸۹۵ میں مہمند کے علاقے میں اور ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۰ تک وزیرستان میں انگریزوں نے وسیع پیمانے پر جنگی کارروائیاں کیں۔ اس کے بعد سات سال کے دوران پاکستان کے معرض وجود میں آنے تک فرنٹیئر میں کسی نہ کسی جگہ جنگ جاری رہی۔ اقوام عالم اچھی طرح آگاہ ہیں کہ آخر انھی صدیوں طویل جنگ کا باعث کیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ پٹھان اپنی آزادی کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں اور آزادی کی خاطر لڑنے کے لیے وہ ہر لمحہ تیار رہتے ہیں۔

تو یہ ہیں وہ لوگ جو آج ہماری قوت کا ایک اہم عنصر ہیں۔ وہ جو ۱۹۴۷-۴۸ء میں کشمیر محاذ پر گئے تھے، انہی میں سے تھے۔ جس طرح وہ اجنبی علاقے میں، گھروں سے سینکڑوں میل دور اُس باقاعدہ فوج کے خلاف جو جدید اسلحہ سے لیس تھی اور جسے توپخانے اور ایئر فورس کی بھرپور مدد حاصل تھی، اپنی ہی بنائی ہوئی رائفلوں سے لڑے۔ شاید اور کوئی اس طرح نہ لڑ سکتا۔

ان میں بہت سے شہید ہو گئے اور بہت سے زخمی ہو کر گھروں کو گئے۔ ان کے نام کسی یادگاری مینار پر کندہ نہیں کیے گئے۔ انھیں یاد رکھنے کے لیے کوئی یادگار بنائی ہی نہیں گئی۔ لیکن انھوں نے پاکستان کی تاریخ کا پہلا باب اپنے خون سے لکھنے کا شرف حاصل کیا ـــــ اور قبائلی علاقوں میں ان کی بیوائیں اور لواحقین اسی طرح فخر سے اور احترام سے ان کا نام لیتے ہیں جس طرح وہ صدیوں سے لیتے چلے آئے ہیں۔ یہی ان کی صدیوں پرانی روایت ہے ـــــ اپنی آزادی کے تحفظ میں لڑنا مرنا کٹنا اور ایک روایت بن کر ہمیشہ زندہ رہنا۔